تعلیم و تربیت
ستمبر 2012
صفحہ نمبر: 32
www.paksociety.com

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: بھولا بھالو اسکول چلا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آج ہم آپ کو اُس تقریب کا احوال سناتے ہیں جس میں ہمارے پیارے قائد نے اپنی علالت کے باوجود شرکت کی تھی۔ یکم جولائی 1948ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح تھا۔ یہ وہ آخری سرکاری تقریب تھی جس میں قائداعظم تشریف لائے تھے۔ اُن دنوں آپ شدید بیمار ہونے کے باعث زیارت میں زیرِ علاج تھے۔ آپ نے زیارت سے کراچی تک کا سفر کیا اور مقررہ وقت پر تقریب میں پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ شرکاء کی اگلی کرسیاں ابھی تک خالی ہیں۔ آپ نے مقررہ وقت پر تقریب شروع کرنے کے لیے کہا اور ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ خالی کرسیاں اٹھالی جائیں۔ اُن کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ تقریب میں بعد میں آنے والے شرکاء نے کھڑے ہو کر تقریب میں شرکت کی اور تقریب کے اختتام پر قائداعظم سے معذرت کی۔ یوں قائداعظم شرکاء کو وقت کی پابندی کا احساس دلانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ ہے اُس عظیم قائد کی زندگی کی ایک جھلک جو ہم سے 11 ستمبر 1948ء کو جدا ہوئے تھے۔ پیارے قائد کا ہر عمل اور ہر قول ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ان کے فرمودات پر ہم سچے دل سے عمل کریں تو پیارا پاکستان جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ قائد سے محبت کا تقاضا ہے کہ ان کے افکار پر عمل پیرا ہو کر ہم پاکستان کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں اور اُن مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کریں جن کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

6 ستمبر کا دن ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب 47 سال قبل ہمارے ازلی دشمن نے ہمیں کم زور سمجھ کر رات کے اندھیرے میں ہم پر اچانک حملہ کیا تھا۔ پاک فوج کے بہادر جوانوں نے بے مثال جرأت و بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کو ایسا منہ توڑ جواب دیا تھا کہ وہ اپنے فوجیوں کی لاشیں اور سامان میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جنگِ ستمبر کے حوالے سے پاک فوج کے بہادر جوانوں کی بے مثال قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

اِس ماہ سے ہم نے آپ کے لیے ایک نیا سلسلہ ''پیارے اللہ کے پیارے نام'' کا آغاز کیا ہے۔ اِس سلسلے کے بارے میں اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

آخر میں یہ بات بھی جان لیجیے کہ رائینو نے ''کتاب دوستی'' مہم کے تحت آپ کے لیے آسان انعامی مقابلے کا اہتمام کیا ہے۔ اس مقابلے میں حصہ لے کر انعامی کتب کا تحفہ حاصل کریں۔ تفصیلات جاننے کے لیے رائینو کا اشتہار ملاحظہ کیجیے۔

اب آپ اِس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبد السلام	ظہیر سلام	نذیر انبالوی	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 500 روپے۔ | ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔ | امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 25 روپے

پیارے بچو! ہمیں دُنیا میں رہنے کے لیے بہت سے افراد کی ضرورت پڑتی ہے، جو ہماری ضروریاتِ زندگی میں ہمارے معاون و مددگار ہوتے ہیں، انہی کی بدولت ہم ترقی کی منازل طے کرتے اور کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ ان افراد کو ملا کر جو ایک اجتماعی شکل بنتی ہے اس کو "معاشرہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ معاشرہ کی بنیاد باہمی میل جول پر قائم ہے، جیسا کہ اساتذہ آپ کے لیے علم حاصل کرنے میں راہ نمائی کرتے ہیں، باغبان آپ کے چمن میں محنت کرتا ہے تو چمن سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے اور اس میں رنگ برنگے پھول کھل اٹھتے ہیں، شیرفروش آپ کو دودھ فراہم کرتا ہے، درزی آپ کے لیے کپڑے سلائی کرتا ہے، خاکروب آپ کے گلی کوچے کی صفائی کرتا ہے۔

تو دیکھیے! یہ سب لوگ زندگی میں آپ کے معاون بنتے ہیں اور آپ کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں، اسی طرح بہت سے لوگ آپ کے تعاون کے بھی محتاج ہوتے ہیں مثلاً کسی نے آپ سے پانی طلب کیا آپ نے پانی پلا کر اُس کی ضرورت کو پورا کیا، کسی راہ گیر نے راستہ کی راہ نمائی چاہی تو آپ نے اس کو اس کی منزلِ مقصود پر پہنچا دیا یا اس تک پہنچنے کا راستہ بتا دیا، والدہ یا کسی بھائی بہن نے بازار سے اپنی ضرورت کی اشیاء منگوانا چاہیں تو وہ اُن کو لا کر دے دیں۔ آپس کا یہ میل جول ہی معاشرہ کی بنیاد ہے، اگر یہ میل جول درست طریقے پر ہو تو ایک صالح معاشرہ قائم ہوتا ہے ورنہ معاشرہ کا امن تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ وہ درست طریقہ یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد خلوصِ دل کے ساتھ دُوسرے فرد کے کام آئے، دُوسرے کی ضرورت پوری کرنا اپنے بھلے اور فائدہ کی خاطر نہ ہو بلکہ دُوسرے کا فائدہ اپنے فائدہ پر مقدم ہو۔ بڑے چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش آئیں اور چھوٹے ان کا دل سے ادب کریں اور ان کی نصیحتوں پر عمل کریں۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے۔

"جب کوئی جوان کسی عمر رسیدہ بزرگ کی اس کی بڑھاپے کی وجہ سے تعظیم و تکریم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگ مقرر فرما دیتا ہے کہ جو اُس کے بڑھاپے کے وقت اُس کی تعظیم و تکریم کریں گے۔" (ترمذی شریف)

اس حدیث شریف میں رحمت دو عالم ﷺ نے اسی معاشرہ سے متعلق ایک ایسی بات سکھائی ہے جس کا تعلق صرف رشتہ داروں سے نہیں بلکہ ہر اس بزرگ سے ہے جو عمر میں آپ سے بڑا ہو۔ یعنی اپنے والدین، اساتذہ، بڑے بھائی، بہن، دادا، دادی، چچا اور ماموں وغیرہ کا ادب و احترام کریں۔ آپ میں سے جو بھی اپنے بڑے کے ساتھ عزت و اکرام سے پیش آئے گا وہ انتہائی سعادت مند ہوگا۔ ان کی ضرورت کو پورا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں مثلاً اگر ان کو بیٹھنے کی ضرورت ہے تو آپ اپنی نشست چھوڑ دیں اور اُن سے بہت خلوص سے کہیں "تشریف رکھیے۔" اگر چلنے میں قدم لڑکھڑا رہے ہیں اور وہ سہارے کے محتاج ہیں تو آپ آگے بڑھ کر اُن کو سنبھال لیں، اگر وہ آپ کو نصیحت کرنا چاہیں تو توجہ سے ان کی نصیحت سنیں، اگر وہ آپ سے کہیں پانی پلا دو تو ان کو پانی پلائیں، اگر وہ بیمار ہیں تو اُن کی بیمار پُرسی کریں، اگر وہ تنہائی کا شکار ہیں اور آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو آپ اُن سے گفتگو کریں اور اُن کی تنہائی دُور کریں۔ جب آپ یوں اپنے بڑوں کا اکرام و تعظیم کریں گے تو یقیناً وہ آپ سے خوش ہو کر آپ کو دُعائیں دیں گے، جس سے آپ کی دُنیا و آخرت کی زندگی سنور جائے گی اور مزید آپ کے حسنِ عمل کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ جب آپ عمر کی اس منزل پر پہنچیں گے تو کوئی اسی طرح آپ کا مددگار و ہم درد آپ کی دل جوئی کرے گا۔

اگر آپ بڑوں کی دُعائیں لینا چاہتے ہیں اور اپنا مستقبل شان دار اور خوش گوار بنانا چاہتے ہیں تو آپ اپنے بڑوں کی تعظیم کیجئے اور ان کی نصیحتوں پر عمل کیجئے۔

ایسی لوٹ مار آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھی ہوگی

علی اکمل تصور

لوٹ لو

لوٹ لو...... بھائی کو لوٹ لو......'' یہ تھی وہ آواز جس نے خالد کو چونکا دیا تھا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ ایک آدمی خود ہی آواز لگائے کہ آؤ مجھے لوٹ لو۔ آج خالد پہلی بار سکول آیا تھا۔ وہ پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی حجام نے اُس کے بال کاٹتے ہوئے اُس کی مونچھیں بھی مونڈ دی ہوں۔ اور اب اُس کو اس بات کا ڈر ہو کہ لوگ اُسے دیکھیں گے اور اُس کا مذاق اڑائیں گے۔ اُس کی شرمندگی کی یہ ایک مضبوط وجہ تھی، لیکن اس وقت خالد وہ وجہ جاننا چاہتا تھا جو لوٹ لو...... بھائی کو لوٹ لو...... کے پیچھے موجود تھی۔

خالد نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک نوجوان تھا۔ اُس نے سکول کے سامنے ٹھیلا لگا رکھا تھا۔ اُس کے ٹھیلے پر مختلف انواع و اقسام کے پاپڑ موجود تھے۔ ان میں نمکین بھی تھے۔ میٹھے بھی اور کھٹے بھی تھے۔ اُس کے اِردگرد بچوں کا ہجوم تھا۔ کسی کے ہاتھ میں پانچ روپے تھے تو کسی کے ہاتھ میں دس روپے تھے۔ وہ نوجوان مستعدی سے بچوں میں پاپڑ فروخت کر رہا تھا اور ساتھ ہی وقفے وقفے سے اُونچی آواز میں صدا بھی لگا رہا تھا۔

''لوٹ لو...... بھائی کو لوٹ لو......''

''لوگوں کو احمق بنا رہا ہے۔ بچوں سے روپے بھی لے رہا ہے۔ اور لوٹ لو...... لوٹ لو...... کا نعرہ بھی لگا رہا ہے......''

خالد نے جیسے خود سے سرگوشی کی۔

''کیا کہا ابو آپ نے؟'' یہ خالد کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے ابو کی بات سمجھ نہیں پایا تھا۔

''کچھ نہیں بیٹا...... ایسے ہی......'' اتنے میں گھنٹی کی آواز سب کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ سکول شروع ہونے کا اشارہ تھا۔ سب بچے سکول کے مین گیٹ کی طرف بھاگے۔ خالد نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو موٹر سائیکل سے اتار دیا تھا۔

''میں تمہیں چھٹی کے وقت لینے آ جاؤں گا......'' بچے سکول کے اندر گئے تو خالد نے واپسی کی راہ لی۔ بچوں کا یہ سکول شہر سے ذرا دُور واقع تھا۔ آج بچوں کا سکول میں پہلا دن تھا۔ یہ خالد کی مجبوری تھی کہ اُسے بچوں کو اس سکول میں داخل کروانا پڑا تھا۔ ورنہ تو اُس کے بچے شہر کے سب سے معیاری سکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ خالد کا کاروبار اور زندگی کا نظام بہت اچھے طریقے سے چل رہا تھا۔ پھر اس کی خوش حال زندگی کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ اس کا اپنا پولٹری فارم تھا۔ اس کے فارم میں پچیس ہزار مرغیوں کو پالنے کی گنجائش موجود تھی۔ پھر راتوں رات مرغیوں کو ایک وبائی مرض نے گھیر لیا۔ یہ مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ خالد نے ادویات کے ذریعے اس مرض پر قابو پانے کی بہت کوشش کی، لیکن تمام تدابیر بے سود ثابت ہوئیں۔ اور تین دن میں ہی فارم کی تمام مرغیاں ہلاک ہوگئیں۔ خالد قرض کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ اب اُسے اپنے وسائل کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی گزارنے کی منصوبہ بندی کرنا تھی۔ پہلا مرحلہ بچوں کے سکول کی تبدیلی کا تھا۔ کیوں کہ وہ اب مہنگے سکول کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس نئے سکول میں بچوں کو داخل کروا کر اُس کے دل پر بوجھ تھا۔ اُسے اس بات کا

ہرگز احساس نہیں تھا کہ تعلیم سستی یا مہنگی نہیں ہوتی۔ تعلیم تو بس تعلیم ہوتی ہے۔ سستا یا مہنگا تو انسان کا طرزِ زندگی ہوتا ہے جو وہ خود بناتا ہے۔

بچوں کو سکول چھوڑنے کے بعد اب خالد اپنے گھر کی راہ پر تھا۔ وہ سڑک پر آیا تو ایک آدمی نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک لیا۔ وہ اپنے لباس اور انداز سے دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔

''صاحب! اگر آپ شہر جا رہے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے جائیے، مجھے یہاں کوئی رکشہ نہیں مل رہا......'' وہ دیہاتی اپنے گاؤں سے خریداری کی غرض سے شہر جا رہا تھا۔ اُس کی گزارش سن کر خالد کا دماغ گھوم گیا۔

''کیا میں تمہیں کوئی رکشہ ڈرائیور نظر آتا ہوں......'' خالد کا لہجہ تلخ تھا۔ وہ دیہاتی گھبرا گیا۔

''صاحب! میں نے ایسا تو نہیں کہا......''

''تمہارا مطلب تو یہی ہے......'' اتنا کہہ کر خالد نے اپنی موٹرسائیکل آگے بڑھا دی۔ وہ دیہاتی دیکھتا ہی رہ گیا۔ خالد طوفانی رفتار سے شہر کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ اُس نے نہیں سنا تھا، لیکن دیہاتی نے اُس کی زیادتی کے باوجود اُسے دُعا دی تھی۔

''صاحب! اللہ آپ کو ہدایت دے......''

خالد اپنے گھر پہنچا تو اُس کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ پہلے ہی ایک سخت گیر آدمی تھا، کاروبار میں برداشت سے باہر نقصان نے اُسے اور بھی زیادہ چڑچڑا بنا دیا تھا۔ گرمی کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ خالد کی بیوی نے اُسے ٹھنڈے پانی کا گلاس دیا، لیکن خالد کسی اور سوچ میں گم تھا۔

''ایسے کام نہیں چلے گا۔ کاروبار میں نقصان ہوا ہے تو اُسے کاروبار ہی پورا کرے گا۔ میں ابھی بشارت کو فون کرتا ہوں۔''

پھر اُس نے بشارت کا فون نمبر ملایا۔ بشارت اس کا دوست تھا۔ وہ جائیداد کی خرید وفروخت کا کام کرتا تھا۔ اچھے وقت میں خالد نے ایک پلاٹ خریدا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ یہ پلاٹ فروخت ہو جائے اور وہ اپنے کام کا دوبارہ آغاز کر سکے۔ پلاٹ کی فروخت کے حوالے سے اُس نے بشارت کو پہلے ہی ہدایت کر رکھی تھی۔ اب وہ بشارت سے پوچھنا چاہتا تھا کہ پلاٹ کا کوئی خریدار آیا ہے یا نہیں۔ بات چیت کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ ابھی کوئی خریدار نہیں ہے۔ اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک عورت خالد کے گھر میں داخل ہوئی۔

''اے بہن گرمی بہت ہے۔ تھوڑی سی برف مل جائے تو پانی ٹھنڈا کر لوں......'' وہ خالد کی بیوی سے کہہ رہی تھی۔

''دیکھتی ہوں بہن فریج میں برف ہے یا نہیں......''

وہ کمرے میں آئی تو سامنے خالد بیٹھا تھا۔ خالد نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ بے چاری سہم گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے جھوٹ بولا۔

''بہن برف نہیں ہے......'' وہ عورت واپس لوٹ گئی۔

''ہم کسی سے مفاد لیتے ہیں جو لوگ ہمارے پاس مفاد لینے آ جاتے ہیں......'' خالد غصے سے بولا۔

''تم گھر کا دروازہ بند رکھا کرو۔ اور اگر کوئی مطلب پرست آئے تو اسے دروازے سے ہی رخصت کر دیا کرو......'' خالد کی بیوی اُس کی ذہنی کیفیت سے واقف تھی اس لیے اُس نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ بچوں کی چھٹی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ خالد نے اپنی موٹرسائیکل نکالی اور سکول کی طرف روانہ ہو گیا۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے سفر کے بعد خالد سکول کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ سکول کے باہر وہ ٹھیلے والا موجود تھا۔ جو ''لوٹ لو...... بھائی کو لوٹ لو'' کی آواز لگاتا تھا۔ اُس نے سائے کے لیے اپنے ٹھیلے کے اُوپر کپڑا باندھ رکھا تھا۔ خالد کو دھوپ میں کھڑا دیکھ کر اُس نوجوان نے کہا۔

''باؤ جی...... یہاں چھاؤں میں آ جائیے......'' خالد خاموشی سے اُس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''شکریہ......'' اب وہ دونوں چھٹی ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر گھنٹی کی آواز فضا میں گونجی۔ بچے شور مچاتے سکول سے باہر نکلنے لگے۔

''لوٹ لو...... بھائی کو لوٹ لو......'' وہ پاپڑ فروخت کرنے

والا نوجوان اپنی مخصوص آواز لگانے لگا تھا۔ بچے اُس کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ خالد کی نظریں اپنے بچوں کی تلاش کر رہی تھیں۔ اُن کی آمد میں شاید تاخیر تھی۔ ایسے میں خالد نے دیکھا۔ ایک بچہ للچائی نظروں سے ٹھیلے کے پاس کھڑا پاپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بچے کیا چاہیے؟" ٹھیلے والے نے بچے سے پوچھا۔ اُس نے انگلی کا اشارہ پاپڑوں کی طرف کر دیا۔

"کتنے کے لو گے؟" ٹھیلے والے نے بچے کے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

"پیسے نہیں ہیں....." بچہ بولا۔

"تو کیا ہوا۔ لوٹ لو..... بھائی کو لوٹ لو....." ٹھیلے والے نے ایک لفافے میں پاپڑ ڈال کر بچے کے حوالے کر دیئے۔ بچے کی تو جیسے عید ہو گئی تھی۔ وہ اچھلتے کودتے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ خالد کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ اس ٹھیلے والے کی صدا کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"تو یہ لوٹ مار مچائی ہے تم نے....." خالد مسکرایا۔

"جی باؤ جی..... بچے ہیں، کسی کو جیب خرچ ملتا ہے کسی کو نہیں، لیکن ان بچوں کی خوشی میرے دل کو سکون دیتی ہے۔ اور پیسوں کا کیا ہے۔ روزی تو اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔ میں ان بچوں پر خرچ کرتا ہوں تو اللہ میرے رزق میں اور برکت دیتا ہے۔ باؤ جی جس چھت میں نکاسیِ آب کا راستہ نہیں ہوتا وہ چھت گر جاتی ہے....." خالد کو اچانک ہی پسینہ آ گیا تھا۔ یہ گرمی کا پسینہ نہیں تھا۔ یہ شرمندگی کا پسینہ تھا۔ خالد سمجھ گیا تھا کہ اُس کی چھت میں نکاسیِ آب کا راستہ نہیں تھا۔ تبھی اُس کے سر پر موجود خوش حالی کی چھت زمین بوس ہو گئی تھی۔

"ابو جی! گھر چلیں..... بہت گرمی ہے....." خالد کے بچے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہے تھے۔

"ہاں..... ہاں چلتے ہیں....." خالد اپنی سوچوں کے سمندر سے باہر نکل آیا۔ اُس نے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔ اور پھر وہ سب موٹر سائیکل پر بیٹھ گئے۔ گلی کا موڑ مڑتے ہی جیسے ہی خالد سڑک پر آیا۔ اُس نے ایک بچے کو دیکھا۔ وہ بچہ سکول یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے کندھوں پر وزنی سکول بیگ موجود تھا۔ وہ سخت گرمی میں سڑک کنارے کھڑا تھا۔ خالد نے اُس کے پاس اپنی موٹر سائیکل کھڑی کر دی۔

"بیٹا! تمہیں کس کا انتظار ہے؟"

"میرے ابو نہیں ہیں، امی مجھے سکول آنے جانے کا کرایہ دے دیتی ہیں۔ اب میں کسی بس کا انتظار کر رہا ہوں....." یہ بات سن کر خالد کا دل پسیج گیا تھا۔

"ان بچوں کی خوشی دل کو سکون دیتی ہے..... میں ان بچوں پر خرچ کرتا ہوں تو اللہ میرے رزق میں اور برکت دیتا ہے..... جس چھت میں نکاسیِ آب کا راستہ نہیں ہوتا وہ چھت گر جاتی ہے....." خالد کے کانوں میں اس ٹھیلے والے کی باتیں گونج رہی تھیں۔ فطرت اور عادت باتوں سے تبدیل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ٹھیلے والے نے اپنے عمل سے اپنی باتوں کو ثابت کیا تھا۔ اور اب خالد نے اُسی کے راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"آجاؤ بیٹا! میں تمہیں شہر تک لیے چلتا ہوں....." وہ بچہ خوش ہو گیا اور اچھل کر موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ اس ایک لمحے میں خالد نے سکون اور خوشی کو اپنے وجود میں اترتے محسوس کیا۔ اب خالد نے اللہ کے راستے میں لٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"لوٹ لو..... لوٹ لو....."

خالد جب گھر پہنچا تو اُس کی بیوی مسکرا رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" خالد کی آواز میں مٹھاس تھی۔

"بھائی بشارت کا فون آیا تھا۔ اُن کے پاس ہمارا پلاٹ خریدنے کے لیے ایک گاہک آ گیا ہے۔ آپ اُن سے مل لیجیے....."

"یا اللہ تیرا شکر ہے....." خالد کے منہ سے یہ الفاظ نکلے اور پھر یہ بات سوچ کر اُس کا سر جھک گیا کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ نہ کر کے کتنا بُرا کرتا رہا ہے۔

"لوٹ لو..... بھائی کو لوٹ لو۔" کی صدا ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

☆☆☆

ابصار عبدالعلی

بادل کالے بادل

بادل کالے برسیں چھم چھم
پل میں کر دیں مٹی کو نم
موسم کو یہ پیارا کر دیں
دل کش منظر سارا کر دیں
آنکھ مچولی دھوپ سے کھیلیں
سُورج کو سایے میں لے لیں
گل کر دیں بتی یہ دن کی
گڑ گڑ گڑ گڑ گرج ہے اِن کی
کڑک کڑک کڑکائیں بجلی
پل بھر کو ہو جائے روشنی
بادل تو ہیں واٹر ٹینک
یا پھر یہ ہیں واٹر بینک
جمع ہے پانی بادل میں
برسے شہر میں، جنگل میں
بادل گرمی کو کم کر دیں
سڑکوں کو بارش سے بھر دیں
کیوں کوئی پانی کو ترسے
آنگن دھو لو اپنے گھر کے
بہہ گئی مٹی، دُھل گئی دُھول
آنگن بن گیا سوئمنگ پُول
مزے اڑاؤ، آؤ نہاؤ
رم جھم ساز پہ نغمے گاؤ
بارش کی بوندوں میں نہا کر
لازم ہے پھر اندر جا کر
باتھ رُوم کے کھولو نلکے
خوب نہاؤ صابن مَل کے
کھاؤ پکوڑے تیل میں تَل کے
قدم بڑھاؤ ذرا سنبھل کے
بادل کالے، گرجے برسے
چھتری لے کر نکلو گھر سے

سر کے اُوپر ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ
پیر کے نیچے چھپ چھپ چھپ چھپ

ہونہار مصور

پاکستانی جنگی جہاز

اسد الرحمٰن، حافظ آباد (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

مصدق مسعود، کھوٹہ (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

جویریہ رمضان، تونسوی، ملتان (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

یمنیٰ امجد، لاہور (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

مدیحہ زینب، پنڈ دادن خان (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

انظر سعید، کراچی (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: فرقان عابد، میاں والی۔ محمد حسن رضا، جوہر آباد۔ دانیہ عامر، راول پنڈی۔ لیلیٰ جلیل الرحمٰن یوسف زئی، نوشہرہ۔ ارم خان، راول پنڈی۔ تعبیر صالح، بہاول پور۔ عبدالباسط، پتوکی۔ انس الیاس، لاہور۔ محمد عادل خان، واہ کینٹ۔ زین العابدین، راول پنڈی۔ زین العابدین عباسی، محمد یوسف احمد عباسی، پشاور۔ شہزاء عامر، راول پنڈی۔ فرمان اللہ سرحدی، دیر۔ جویریہ یونس، لاہور۔ محمد حسنین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ایمن الیاس، لاہور۔ شاہد اقبال، جاوید اقبال، کراچی۔ نعمان احمد، لاہور۔ نائلہ رضا، ساہی وال۔ اختر علی، سیال کوٹ۔ مسعود احمد، کوئٹہ۔ دانش خان، پشاور۔ عبدالمجید، عبدالحمید، پتوکی۔ ریاض الحسن، فیاض الحسن، کاموئکی۔ راحت حسین، ملتان۔ حافظ فرقان، کراچی۔ نغمہ خان، پشاور۔ داؤد علی خان، نوشہرہ۔ آمنہ نور، اسلام آباد۔ محمد امان شریف، لاہور۔ ☆☆

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

ستمبر کا موضوع: میری گڑیا، پیاری گڑیا — آخری تاریخ 8 ستمبر

اکتوبر کا موضوع: میرا پیارا "تعلیم و تربیت" — آخری تاریخ 8 اکتوبر

شیرا

محمد فاروق دانش

”یہ بچہ کیا ہے میرے آگے، اسے تو میں یوں چٹکیوں میں اڑا دوں گا۔“ نجیب نے اپنے دوستوں میں فخریہ انداز میں کہا اور رنگ میں اتر گیا۔

اُس کے سامنے بہ ظاہر ایک سوکھا سا لڑکا تھا جس کی پسلیاں بھی گنی جا سکتی تھیں جب کہ وہ خود ایک تگڑا اور کڑیل جوان تھا۔ اُس کی خوراک میں روزانہ دو کلو دودھ، خشک میوہ جات، بکرے کا تازہ گوشت اور تازہ جوس شامل ہوتے تھے۔ پھر اس کی روزانہ کی پریکٹس اس کے علاوہ تھی۔ وہ باکسنگ میں خاصی مہارت رکھتا تھا اور کئی ساتھیوں کو چت بھی کر چکا تھا۔ جب کہ اس کے مقابلے پر آنے والا سوکھا سا لڑکا کوئی خاص شہرت نہ رکھتا تھا۔ کوئی خاص مقابلوں کی جیت بھی اس کے حصے میں نہ تھی ایسے میں نجیب پر فخر کا غالب آنا فطری امر تھا۔

دونوں طرف سے تیاری مکمل ہوئی۔ رنگ کی سیٹنگ درست نظر آئی تو ریفری نے مقابلے کی افتتاحی وسل بجا دی۔ کھیل شروع ہوا۔ ابتداء میں تو نجیب نے اپنے ظاہری ڈیل ڈول اور چہرے کی رعونت سے رنگ میں اپنا نفسیاتی رعب جما لیا۔ تماش بین بھی اندازہ لگا چکے تھے کہ یہ طاقت ور اس کم زور کو مارے ہی مارے۔ اُس سوکھے لڑکے نے شروع کے چند منٹ تو اُس کے وار کو دفاعی انداز سے روکنے میں لگا دیے جس سے دیکھنے والوں کی ساری توجہ نجیب کی جیت کی طرف ہو گئی۔

جب دو چار مکے اس لڑکے کو پڑے تو نجیب کو داد دینے اور واہ واہ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔

جب لڑکے نے دیکھا کہ نجیب خوب اُچھل اُچھل کر اپنی توانائی خاصی خرچ کر چکا ہے تو اب اُس نے کچھ کر گزرنے کا ارادہ کر لیا۔ اُس نے انتہائی پھرتی اور چابک دستی سے وہ وار کیے کہ نجیب بھی چکرا گیا۔ اُسے قطعی اُس سوکھے سے لڑکے سے اس انداز کے حملوں کی اُمید نہ تھی۔

کچھ دیر پہلے تک نجیب اپنی بھرپور طاقت دکھا رہا تھا جب کہ اُسے وہی طاقت اب اپنے دفاع اور اپنے آپ کو بچانے میں لگانا پڑ رہی تھی۔ دو چار اور حملے اس پر ایسے ہوئے کہ بالآخر اُس کے لیے بچنا مشکل ہو گیا اور وہ گر گیا۔

ایک بار تو ہمت کر کے وہ اٹھا اور اس نے اپنے داؤ پیچ آزمانے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ لڑکا بڑی مہارت سے لڑ رہا تھا۔ اب اُسے سمجھ آ چکی تھی کہ اُس نے محض اس کی ظاہری حالت دیکھ کر اُس کی طاقت کے بارے میں اندازہ لگانے کی جو کوشش کی تھی وہ غلط ثابت ہوئی تھی۔

مجمع جو ابتداء میں اس کے حق میں نعرے لگا رہا تھا، اب اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ ایک تو اس کی ہمت ویسے بھی جواب دے چکی تھی، اب ان نعروں نے اس کا حوصلہ بالکل پست کر دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک مکا کھا کر چاروں شانے ایسا چت گرا کہ ریفری کے دس تک گننے کے باوجود بھی نہ اٹھ سکا۔ ریفری نے اُس سوکھے لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور فاتحانہ انداز سے ہوا میں لہرا دیا۔

''شیرا، شیرا، شیرا..............'' ہر طرف نعرے گونج اٹھے۔

وہ بغیر کسی تکبر کے مسکرایا اور اپنے دوستوں کے نعروں کا جواب ہاتھ لہرا لہرا کر دینے لگا۔

''تم واقعی لاجواب کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہو۔'' شیرا کے استاد نے اُسے توصیفی کلمات سے نوازا۔

''کل کی تمہاری کارکردگی نے ہمارے ادارے کا نام بلند کر دیا ہے۔'' پرنسپل صاحب نے اُس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ایسے شاگرد ہو جو پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیلوں میں بھی نمبر ون ہو۔''

''یہ تو آپ کا حسنِ نظر ہے سر!'' شیرا نے خوش دلی سے کہا۔

''تمہاری عمدہ کارکردگی کی بناء پر اسکول انتظامیہ نے تمہیں دو سال کے لیے اسکالرشپ دینے کا ارادہ کیا ہے۔''

''میں آپ کی اس عنایت پر تہہ دل سے ممنون ہوں۔'' اُس نے انکساری سے کہا۔

''تم یہ تو بتاؤ کہ مستقبل کے حوالے سے تمہارے کیا ارادے ہیں؟'' پرنسپل صاحب نے اس سے سوال کیا۔

''میرا ارادہ.....'' اس سوال کے جواب میں شیرا کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ اُس وقت فضا میں ایک جہاز پرواز کر رہا تھا۔ ''میں اقبال کے شاہین کی طرح فضا میں اڑنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''میں جہاز اڑاؤں گا۔ میں اپنی پاک فوج کا حصہ بنوں گا۔'' اُس نے جو جوش سے مکا فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ''میری یہ طاقت، یہ صلاحیتیں اپنے دشمنوں کے دانت کھٹے کرنے کے لیے استعمال ہوں گی۔''

''ویری گڈ!'' پرنسپل صاحب بولے۔ ''اللہ تمہیں تمہارے نیک مقاصد میں ضرور کام یاب کرے گا۔''

''شکریہ سر!'' اُس نے تعریفی انداز میں کہا۔

☆☆☆

دیکھنے والوں کی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ فضا میں جہاز کا پائلٹ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا۔ آج 6 ستمبر کا دن تھا۔ قوم یومِ دفاع منانے میں مصروف تھی۔ پاک فضائیہ کے جہاز بڑی خوب صورتی سے جہازوں کے کرتب دکھا کر عوام کو محظوظ کر رہے تھے۔ شیرا بھی ان ہی پائلٹوں میں سے

ایک تھا۔ اس کا خواب یہی تھا کہ وہ فوج میں شامل ہو کر اپنے وطن کی حفاظت کا فریضہ انجام دے گا۔ اللہ نے اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر کر دیا تھا۔ وہ پاک فضائیہ میں ائیرمین کی حیثیت سے شامل ہو کر اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں اور بھرپور محنت کے باعث وہ اپنی جداگانہ حیثیت بنانے میں کام یاب ہو گیا تھا۔

اس کے ادارے نے اس کی بے مثال کارکردگی دیکھتے ہوئے اُسے ''شاہین بچہ'' کے لقب سے نوازا۔ وہ بے حد مسرور تھا۔ اس کے دوستوں، رشتہ داروں نے اسے مبارک باد دی تو وہ مزید پُرعزم ہو گیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ آرمی میں آگے آگے اور آگے بڑھتا چلا جائے۔

''نوجوان! ہم تمہاری کارکردگی سے بے حد خوش ہیں۔'' جب افسر نے اُسے اعزاز دیے جانے والی تقریب میں پکار کر کہا تو اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔

''میں آپ کی اس حوصلہ افزائی پر بے حد ممنون ہوں۔'' اُس نے جوش سے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

''تم نے بہت تھوڑے سے وقت میں بے حد نام کمایا ہے، پاک فوج کو تم جیسے جوانوں پر بے حد فخر ہے۔'' افسر نے اس کی مزید حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

''سر! میں آپ کی اُمیدوں پر پورا اُترنے کی مزید کوشش کروں گا۔'' اُس نے سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔

''اتنی پھرتی اور جواں مردی دکھاتے ہوئے تمہارے پیشِ نظر کیا ہوتا ہے؟'' افسر نے سوال کیا۔

''سر! میں قائداعظم کے فرمان کام، کام اور کام کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہوں۔'' اُس نے اپنی روشن آنکھوں کو اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے کہا۔

''ویل ڈن جوان!'' اُسے ایسا لگا کہ افسر نے اس کا شانہ تھپتھپا کر اُس پر بھاری بوجھ ڈال دیا ہو۔

''سنو جوان!'' اس کا افسر اس کی ٹریننگ کی تکمیل کے بعد ایک روز اس سے مخاطب تھا۔

''جی سر!''

''اب تمہاری ٹریننگ پوری ہو چکی ہے اور ہم نے تمہارے مضبوط کاندھوں پر بھاری ذمہ داری ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہے۔''

''میں یہ فریضہ نبھا کر فخر محسوس کروں گا سر!'' اُس نے نہایت سنجیدگی سے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''ہمارا دشمن بہت چالاک اور خطرناک ہے۔'' افسر اس سے مخاطب تھا۔ ''وہ ہمارے وطن کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔''

''مجھے کیا کرنا ہو گا سر!''

''ہمارا محاذ کارگل کا ہے میرے دوست!'' وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔ ''سترہ اٹھارہ ہزار فٹ بلند وہ چوٹیاں ہمارے لیے بہت اہمیت حاصل کر چکی ہیں۔ ان پہاڑوں پر سارا سال برف جمی رہتی ہے۔''

''جی سر!''

''دشمن ہمارے اس علاقے پر بھی اپنی میلی نظر رکھتا ہے اور اس پر قابض ہونا چاہتا ہے۔''

''ہم اس کے ارادوں کو خاک میں ملا دیں گے۔'' اُس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''مجھے تم سے یہی اُمید تھی جوان!'' افسر نے اُسے جوش سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں دشمن کی ہر ہر حرکت پر نظر رکھنی ہے اور اسے آگے بڑھنے سے ہر صورت روکنا ہے۔''

''سر! میری یہ جان اپنے مشن کو پورا کرنے کے لیے حاضر ہے۔'' شیرا نے انتہائی مستعدی سے کہا۔

☆☆☆

''سر! بہت زبردست! ہم دشمن فوج کی سرگرمیوں کو محدود کرنے میں کام یاب ہو چکے ہیں۔'' اُس کے نائب نے شیرا (شیر خان) کو سراہتے ہوئے کہا۔

''فوج میں رہتے ہوئے ہمارا کام ہی دشمن کو روکنا اور اس سے لڑنا ہے۔''

40 کے سپاہیوں کا خاتمہ کر دیا۔ دشمن فوج نے اپنے بھاری جانی نقصان کے بعد پوری شدت سے حملے کی تیاری کی۔ اس نے پوری دو

بٹالین کے ساتھ شیر خان کی چوکی پر کئی جانب سے حملہ کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ دشمن نے اپنے توپ خانے سے کوئی بارہ ہزار گولے برسائے۔ یہ ایک بہت بڑا حملہ تھا۔ یہ حملہ شیر خان کے لیے کسی چیلنج سے کم نہ تھا۔ آپ نے ہمت نہ ہاری اور دشمن کے حملے کا منہ توڑ جواب دیتے رہے۔

دشمن کا حملہ شدید تھا اس سے نمٹنا آسان نہ تھا۔ کیپٹن کرنل شیر خان نے بھرپور کوشش کی، وہ خود بھی شدید زخمی ہو گئے۔ ان کے جوان بھی ڈٹے رہے۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود بھی کیپٹن کرنل شیر خان کا ہاتھ لبلبی سے نہ ہٹا اور وہ فائر کرتے رہے اور اسی عالم میں جامِ شہادت نوش کر لیا۔ ان کے اس انداز نے ٹیپو سلطان شہید کی یاد دلا دی کہ جن کا ہاتھ شہادت کے وقت بھی تلوار میں پیوست تھا۔

کیپٹن کرنل شیر خان، ہمارے وطن کے وہ ہیرو ہیں جنہوں نے کارگل کے محاذ پر بے مثال اور لازوال کارنامے سرانجام دے کر اپنے وطن کی خاطر جان کی قربانی پیش کی۔ ان کی اس عظیم قربانی کے پیشِ نظر انہیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز ''نشانِ حیدر'' پیش کیا گیا۔ قوم اپنے اس عظیم سپوت کو ہدیہ سلام پیش کرتی ہے۔

''سر! آپ پچھلی کئی راتوں سے نگرانی میں مصروف ہیں۔ اب کچھ گھنٹے آرام کر لیں۔'' نائب نے کہا۔

''علی احمد! اگر میں آرام کرنے لگ گیا تو دشمن کو اپنی کارگزاری کا موقع مل جائے گا۔'' شیر خان عرف شیرا نے کہا۔

''وہ دیکھیے سر! دشمن کے فوجی اُس طرف سے بڑھ رہے ہیں۔'' نائب علی احمد نے ایک طرف اشارہ کیا۔

کیپٹن کرنل شیر خان نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے فوراً مشین گن سے برسٹ چلائے۔ دشمن فوجی گھبرا گئے اور فوراً انہوں نے اپنی پیش قدمی روک دی۔ وہ مسلسل فائر کرتے رہے۔ مجبوراً دشمنوں کو بھاگنا پڑا۔

''دیکھو میرے دوستو! میں نے یہ لڑاکا گشت ترتیب دی ہے۔ ہم اس کے ذریعے آگے حرکت کریں گے اور ہمیں دشمن فوجیوں کو ہلاک کرنا ہے۔'' کیپٹن کرنل شیر خان نے اپنی حکمت عملی سے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کیا۔

''آپ ہمیں تیار پائیں گے۔'' اُن کے ساتھیوں نے جواں مردی سے کہا اور پھر ان کی لڑاکا گشت نے آگے بڑھنا شروع کیا اور موثر انداز سے دشمن پر حملہ کرتے گئے۔ وہ 8 جون 1999ء کی رات تھی۔ کیپٹن کرنل شیر خان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دشمن

اَلْقَھَّارُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(سب پر قابو رکھنے والا)

تعریف: ''اَلْقَھَّارُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' وہ ذات ہے جس کے دبدبے اور غلبے کے سامنے ساری مخلوق عاجز اور بے بس ہے اور جس کے سامنے تمام گردنیں جھک جاتی ہیں۔

تشریح: قرآن کریم میں ''اَلْقَھَّارُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' کا نام مبارک 6 جگہ آیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ عربی زبان والا قہار ہے اُردو زبان والا نہیں۔ عربی زبان میں ''اَلْقَھَّارُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' سے مراد وہ ذات ہے، جس کے سامنے ہر چیز مغلوب ہو اور وہ سب پر غالب ہو۔

وہ ایک خط

نثار صاحب! کلاس میں داخل ہوئے تو سب بچوں کو بے تابانہ نظروں سے اپنی طرف متوجہ پایا۔ وہ مختلف ملکوں کے عجائبات کے بارے میں کئی روز سے لیکچر دے رہے تھے۔

''سر! کل آپ نے ہمیں اہرام مصر کے بارے میں بتایا تھا اور پیریڈ ختم ہونے سے پہلے آپ نے کہا تھا کہ کل دریائے نیل کے بارے میں بتایا جائے گا۔'' صادق نے اپنے استاد نثار صاحب کو یاددہانی کروائی۔

''جی ہاں بالکل! آج آپ کو دریائے نیل کے بارے میں بتائیں گے۔ تو سب متوجہ ہیں نا!!''

''جی سر!'' تمام بچے یک زبان ہو کر بولے۔

''ذرا توجہ سے سنیے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مشہور صحابی ہیں۔ وہ مصر کی مہم سر کرنے والے لشکر کے سردار تھے۔ جب انہوں نے مصر فتح کر لیا تو عجمی سال کے ''بونہ'' مہینے کے شروع ہونے پر مصر والے ان کے پاس آئے اور کہا۔

''امیر صاحب! ہمارے اس دریائے نیل کی ایک عادت ہے۔ جس کے بغیر یہ دریا نہیں چلتا۔''

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا: ''وہ عادت کیا ہے؟''

انہوں نے کہا: ''جب اس مہینے کی بارہ راتیں گزر جاتی ہیں تو ہم ایک ایسی بچی تلاش کرتے ہیں جو اپنے والدین کی اکلوتی ہو۔ اس کے والدین کو راضی کرتے ہیں اور اسے سب سے اچھے کپڑے

اور زیور پہنا کر اس دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ تب جا کر یہ دریا دوبارہ بہنا شروع کرتا ہے ورنہ نہیں چلتا۔"

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "یہ صحیح طریقہ نہیں۔ اسلام ایسے کام کی اجازت نہیں دیتا۔ کیوں کہ اسلام نے اپنے سے پہلے کے تمام غلط طریقے ختم کر دیئے ہیں۔" چناں چہ مصر والے "بونہ، ابیب، اور مری" (تین مہینوں کے نام ہیں) تک ٹھہرے رہے اور آہستہ آہستہ دریائے نیل کا پانی بالکل ختم ہو گیا۔

"جی! میرا ایک سوال ہے؟" مسرور نے کہا۔

"کیا سوال ہے؟"

"جناب! آج کل لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو حقوق نہیں دیے حالاں کہ اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے پہلے بچیوں کے حقوق کی حفاظت کی......"

"جی! بالکل صحیح بات ہے۔ دراصل یہ اسلام دشمن لوگوں کی چال ہے ورنہ اسلام ہی نے سب سے پہلے عورتوں اور بچیوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔"

"سر پھر کیا ہوا؟" حمزہ حنیف واقعہ سننے کے لیے بے تاب تھا۔

پوری کلاس ہمہ تن گوش تھی حالاں کہ یہ سب سے شرارتی کلاس تھی۔ آج ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

"اچھا تو میں بات کر رہا تھا کہ جب مصر کے لوگوں نے یہ صورت حال دیکھی کہ دریا کا پانی خشک ہو گیا ہے تو انہوں نے مصر چھوڑ کر کہیں اور چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ جب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دیکھا تو انہوں نے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھ کر ان سے مدد چاہی۔ خط میں انہوں نے مصر والوں کی جہالت کا بھی تذکرہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں لکھا آپ نے بالکل ٹھیک کیا۔ بے شک اسلام نے اپنے سے پہلے کے تمام غلط طریقے ختم کر دیئے ہیں۔ میں آپ کو ایک پرچہ بھیج رہا ہوں جب آپ کو میرا خط ملے تو آپ میرا یہ پرچہ دریائے نیل میں ڈال دیں، جب خط حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے وہ پرچہ کھولا اس میں یہ لکھا ہوا تھا۔

ترجمہ: "اے نیل! اگر تم اپنے اختیار سے چلتے ہو تو مت چلو اور اگر تمہیں اللہ اَلْوَاحِدُ الْقَهَّارُ چلاتے ہیں تو ہم اللہ اَلْوَاحِدُ الْقَهَّارُ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ تجھے چلا دے۔"

چناں چہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صلیب کے دن سے ایک دن پہلے یہ پرچہ دریائے نیل میں ڈالا دوسری طرف مصر کے باشندے، مصر سے جانے کی تیاری کر چکے تھے، کیوں کہ ان کے سارے کاروبار اور کھیتی باڑی کا دارومدار دریائے نیل کے پانی پر تھا۔

صلیب کے دن صبح لوگوں نے دیکھا کہ دریائے نیل میں سولہ ہاتھ پانی چل رہا ہے اس طرح "اَلْقَهَّارُ جَلَّ جَلَالُهٗ" نے اپنی قدرت دکھا کر مصر والوں کی اس بُری رسم کو ختم کر دیا۔

اس دن سے لے کر آج تک دریائے نیل مسلسل چل رہا ہے۔ یہ سب "اَلْقَهَّارُ جَلَّ جَلَالُهٗ" کے نام مبارک ہی کی برکت تھی۔ جو بچہ، بچی اس اسم پر جتنا یقین بڑھائے گا تو اس "اَلْقَهَّارُ جَلَّ جَلَالُهٗ" جو نفع و نقصان کا مالک ہے اس کی مدد اُس کے ساتھ ہو جائے گی۔

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام ہی پیارے پیارے ہیں۔ ان ناموں میں کوئی نام بھی عذاب دینے کے معنی میں نہیں ہے "اَلْجَبَّارُ جَلَّ جَلَالُهٗ" اور "اَلْقَهَّارُ جَلَّ جَلَالُهٗ" میں لفظ جابر اور قہار اُردو والے نہیں بل کہ عربی زبان والے ہیں۔

اُردو میں جابر "ظالم" کو کہتے ہیں۔ جب کہ عربی میں جابر اُسے کہتے ہیں "جو سب پر غالب ہو۔" اُردو میں قہار "شدید غصہ کرنے والے" کو کہتے ہیں۔ جب کہ عربی میں قہار اُسے کہتے ہیں جو سب پر قابو رکھنے والا ہو۔

اسلام نے لڑکیوں اور عورتوں کے حقوق کی سب سے زیادہ حفاظت کی ہے۔ اس واقعے میں ہم نے پڑھا کہ حضرت عمر بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بُری رسم کو جاری نہیں رہنے دیا۔ دریا کو خشک کروانا منظور کر لیا لیکن کسی لڑکی کو دریائے نیل میں ڈالنا ہرگز ہرگز گوارا نہیں کیا۔ ہر بچے کو چاہیے کہ صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔ کسی اور مخلوق کا خوف ہرگز اپنے دل میں نہ لائے۔"

آپی نے فون کر کے بتایا دیا تھا کہ آپ جلدی پہنچیں، بس آپ ہی کا انتظار ہو رہا ہے، آپ کے آتے ہی کونین کی سالگرہ کا کیک کاٹ دیا جائے گا۔ بابا بھی جلدی ہی آ گئے تھے۔ مگر خیرو اور عبدالغفار کو تیار کرنے میں امی جان لیٹ ہو گئی تھیں۔ محمد فہد کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ اُڑ کر تائی امی کے گھر پہنچ جائے آخر جب اس سے نہیں رہا گیا تو وہ چیخا۔

''جلدی کریں نا بھئی......''

''چلتے ہیں میرے بچے...... تمہارے بھائیوں کو تو تیار کر دوں......'' امی جان نے پیار سے محمد فہد کو سمجھایا۔ پھر تیار ہوتے ہی وہ سب بابا کی موٹر سائیکل پر تائی جان کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ محمد فہد سب سے آگے جب کہ خیرو اس کے پیچھے ٹینکی پر بیٹھے ہوئے تھے جب کہ عبدالغفار امی کی گود میں تھا۔ آج موسم بھی بہت پیارا تھا اور ان تینوں کو موٹر سائیکل پر گھومنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ابھی موٹر سائیکل کو چلتے ہوئے کوئی دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک بس نے موٹر سائیکل پر جانے والے دو نوجوانوں کو سائیڈ ماری۔ موٹر سائیکل کی رفتار تیز تھی اسی لیے کنٹرول نہ ہو سکی اور لڑکھڑا کر گر گئی۔ جیسے ہی موٹر سائیکل گری پیچھے سے آنے والا ٹرک ان کی موٹر سائیکل کو روندتا ہوا گزر گیا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک نوجوان تو تھوڑا سا زخمی ہوا تھا جب کہ دُوسرا نوجوان موٹر سائیکل کے ساتھ کچلا جا چکا تھا۔ دونوں ہی موٹر سائیکل کے نیچے دبے ہوئے تھے اور دونوں ہی مدد کے لیے پکار رہے تھے، مگر کوئی بھی ان کی مدد کے لیے رک نہیں رہا تھا۔ اس سڑک پر بے انتہا رش تھا۔ لوگ تماش بین کے طور پر تو رک رہے تھے، مگر کوئی بھی ان کی مدد نہیں کر رہا تھا، محمد فہد سے زخمیوں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اُس نے کہا۔

''بابا! آپ ان کی مدد کریں۔''

''بیٹا! ہمیں پہلے ہی دیر ہو گئی ہے......'' بابا جان نے عجیب بات کہی جو محمد فہد کو بہت بُری لگی۔ اُس نے پھر کہا۔

''بابا! کوئی بھی تو ان کی مدد نہیں کر رہا......''

''بیٹا! یہ پولیس کیس ہے، اور کسی نہ کسی نے فون کر ہی دیا ہو گا، ابھی تھوڑی سی دیر میں ایمبولینس آ کر انہیں ہسپتال لے جائے گی......تم بے فکر رہو......''

بابا جان نے اُسے جھوٹی تسلی دیتے ہوئے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ محمد فہد کو اپنے بابا جانی کا یہ رویہ اچھا نہ لگا۔ جس وقت موٹر سائیکل آگے بڑھ رہی تھی وہ بار بار گھوم کر پیچھے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

تائی جان کے گھر پر بہت رش تھا۔ وہاں بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ سب انہی کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد دادا جی آ گئے۔ تایا جان اور پھپھو نے بچوں کے ہاتھوں میں غبارے دے کر کہا تھا کہ جیسے ہی کیک کٹے وہ غباروں کو پھوڑ کر خوب ہلا گلا کریں، خیرو اور عبدالغفار بھی بہت خوش تھے، مگر محمد فہد خاموش، سنجیدہ سا منہ بنائے ایک جانب بیٹھا تھا۔ اس حادثے سے تو جیسے اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اب اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگر بابا جانی زخمیوں کی مدد کر دیتے تو کیا ہو جاتا، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا، اور کسی نے بھی تو ان کی مدد نہیں کی تھی، کچھ دیر بعد گھر میں غبارے پھوٹنے کی دھما دھم آواز نے خوشیوں کو مزید بڑھا دیا پھر سب کو کیک کھلایا گیا۔ محمد فہد کی امی اپنے دنوں چھوٹے بچوں کو کیک کھلا چکی تھی، مگر انہیں محمد فہد کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اسے تلاش کرتے کرتے جب دادا جی کے کمرے میں آئیں تو اُسے منہ بسورے دیکھتے ہی ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے پوچھا۔

"کیا ہوا...... خیر تو ہے، یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

"ایسے ہی......" اُس نے مختصر جواب دیا۔

"کسی نے کچھ کہا ہے کیا......؟" امی نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو......" اُس نے پھر مختصر سا جواب دیا۔

"امی جان ایک مرتبہ رضوان زینے سے گر کر زخمی ہوا تھا تو بابا جانی اسے ہسپتال لے کر گئے تھے جب کہ ابھی آتے ہوئے جو حادثہ ہم نے دیکھا ہے، امی کیا ہمیں زخمیوں کی مدد نہیں کرنی چاہیے تھی......؟" محمد فہد نے اپنی اداسی کا مدعا بیان کیا، اس کے سوال کا امی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"آئندہ ایسا نہیں ہوگا...... میں انہیں کہہ دوں گی، یہ لو کیک تو کھا لو...... ابھی تھوڑی دیر میں کھانا شروع ہونے والا ہے......" محمد فہد نے امی جی کے کہنے پر کیک تو کھا لیا تھا مگر وہ حادثہ ابھی تک اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ امی جی کے کہنے پر وہ کھانے میں شامل تو ہو گیا تھا، مگر اس وقت کوئی بھی چیز اُسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ دکھی دل کے ساتھ ابھی اس نے چند لقمے ہی کھائے تھے کہ خشام دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا اور کان کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔

"محمد فہد سونو بلی کا بچہ نالی میں گر گیا ہے......" خشام کی بات سن کر اس نے کھانا چھوڑا اور فوراً اٹھ کر خشام کے ساتھ باہر کی جانب دوڑ گیا۔ اُسے دیکھتے ہی خیرو اور عبدالغفار بھی ان کے پیچھے دوڑ گئے۔ امی جی کو ان کا جانا بُرا تو لگا، مگر وہ خاموش رہیں۔ جب وہ تینوں بھائی کافی دیر تک نہ آئے تو امی جان کو فکر لاحق ہوئی۔ انہوں نے خیرو کے بابا جانی کو جب بتایا تو وہ بھی فکر مند ہوئے۔ باہر آ کر انہوں نے بچوں کو اِدھر اُدھر تلاش بھی کیا، مگر وہ انہیں نظر نہ آئے۔ جب دادا جان کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بھی پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ اُوپر سے مصیبت یہ ہوئی کہ لائٹ چلی

گئی۔ دادا جان نے سب کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''آپ نے بچوں کو جانے ہی کیوں دیا، نہ جانے وہ چاروں کہاں چلے گئے ہیں۔''

''ابا جی! خشام ان کے ساتھ ہے، آپ فکر نہ کریں......''

بابا جانی نے دادا جان کو بتایا۔

''ارے میاں، خشام بھی تو ابھی بچہ ہی ہے، ایک تو لائٹ نے پریشان کر رکھا ہے، جائیں انہیں گلی میں تلاش کریں۔''

دادا جان کے کہنے پر ہی نذر محمد باہر گلی کی جانب دوڑے۔ تھوڑی دیر بعد وہ چاروں کے ہمراہ گلی میں داخل ہوئے۔ محمد فہد کی گود میں سونو کا بچہ تھا۔ قریب آتے ہی جیسے ہی انہوں نے دادا جان کو دیکھا تو سہم گئے، بابا جانی نے غصے سے پوچھا۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ لوگ؟''

بابا جانی وہ سونو کا بچہ بڑی نالی میں گر کر چبوترے کے نیچے چلا گیا تھا، میرے کہنے پر محمد فہد نے اسے چبوترے کے نیچے سے نکال کر مرنے سے بچایا ہے......''

خشام نے اصل بات بتائی جسے سنتے ہی دادا جان کا سارا غصہ جاتا رہا۔ انہوں نے بہت پیار سے خشام اور محمد فہد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''شاباش! تم نے بہت اچھا کام کیا ہے، مخلوقِ خدا پر رحم کرنا ہی اچھا عمل ہے، مجھے تم پر فخر ہے۔'' دادا جان کی طرف سے شاباش ملنے پر محمد فہد کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اُس نے کہا۔

''دادا جان! سونو بلی اور اس کے بچے ہماری ذمہ داری ہیں ان کی مدد کرنے میں ہمیں کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے نا......''

''جی بیٹا جی......'' دادا جان کے کہتے ہی محمد فہد کا دل بھی خوش ہو گیا۔ اس کے ابو نے آگے بڑھ کر اسے پیار کیا اور بولے۔

''لو میاں اب تو کیک کھا لو اور اپنا منہ میٹھا کر لو کیوں کہ آپ نے ایک اچھا کام کیا ہے۔'' بابا جانی نے سالگرہ کے کیک کا ٹکڑا محمد فہد کے منہ میں ڈال دیا۔ اب وہ میٹھا کیک کا ٹکڑا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا کیوں کہ وہ ایک اچھا کام کر کے جو آیا تھا۔

مضبوط رسی

شیخ سعدی کہتے ہیں کہ ایک دن میرا بازار سے گزر ہوا۔ دیکھا کہ آگے آگے ایک لڑکا اور پیچھے پیچھے ہرن کا ایک بچہ سامنے سے چلے آتے ہیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ ہرن کا بچہ کسی رسی سے بندھا آرہا ہے، لیکن پاس آنے پر معلوم ہوا کہ رسی یا زنجیر کچھ بھی نہیں۔ لڑکے سے پوچھا: ''بیٹا، آخر یہ جنگلی ہرن کا بچہ تم سے اتنا مانوس کیوں کر ہو گیا؟'' لڑکے نے جواب دیا: ''جناب، میں ہر وقت اس کے کھانے پینے کی فکر رکھتا ہوں، کیا یہ احسان زنجیر سے کم مضبوط ہے؟ یہ تو پھر ایک معصوم جانور ہے، چیتے، ریچھ اور بندر جیسے جانور بھی کھلانے پلانے سے آدمی کے فرماں بردار بن جاتے ہیں۔ ان کو جس طرح نچاؤ، ناچتے ہیں اور جس راہ چلاؤ، چلتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''تم سچ کہتے ہو۔ نیکی اور احسان کی مثال اس مضبوط رسی کی ہے جو درندوں تک کو باندھ لیتی ہے۔ پھر آدمی کے ساتھ اگر نیکی کی جائے تو وہ کیوں نہ دوست بن جائے گا۔''

(حمزہ علی، پشاور)

آئیے عہد کریں

جب سے کامران کے گھر کمپیوٹر آیا تھا وہ اُسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اب تو ہر وقت کامران کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا دکھائی دیتا تھا۔ ایک دن وہ حسبِ معمول کمپیوٹر پر نئی آنے والی ویڈیو گیم کھیل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ امی جان نے اُسے نماز پڑھنے کے لیے کہا تو اُس نے جواب دیا کہ وہ ابھی نماز پڑھتا ہے۔ جب مغرب کی نماز کا وقت نکل گیا تو امی جان نے اُسے نماز کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جس بات کی سب سے زیادہ تاکید کی ہے وہ نماز کی ادائیگی ہے، نماز مومن کی معراج ہے۔ نماز کا بروقت ادا کرنا بے حد ضروری ہے۔'' کامران شرمندہ تھا۔ اُس نے عہد کیا کہ وہ آئندہ کبھی نماز کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرے گا اور نماز کی پابندی کرے گا۔ آئیے ہم سب عہد کریں کہ ہم سب نماز پابندی سے پڑھا کریں گے۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں اُن کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہد نامے میں شامل ہونے کے لیے کوپن ارسال کرنا ضروری ہے۔

شاباش

ان بچوں نے عہد کیا کہ وہ موبائل فون کا بے جا استعمال نہیں کریں گے۔

دانیال عزیز شیرازی، کوٹ مومن۔ سعد رشید، بہاول پور۔ محمد حارث بھٹہ، ملتان۔ بلال حسین، اسلام آباد۔ فرحان صدیق، مناحل افضل، لاہور۔ تزئین فاطمہ، ملتان۔ عائشہ رحمٰن، لاہور۔ حرا ممتاز، قصور۔ محمد حسن رضا، جوہر آباد۔ عکاشہ فاطمہ، گجرات۔ عبدالمنان بھٹہ، ملتان۔ عبداللہ محمود، لاہور۔ محمد ثوبان میر، مریم شہناز، گوجرانوالہ۔ ایچ ایم سلیم نور، اوکاڑہ۔ ردا گل، سرگودھا۔ فجر کلثوم، طس کلثوم، چکوال۔ فریال، فیصل آباد۔ سیدہ فبھا فاطمہ شیرازی، ملتان۔ حفصہ خان، حارث تنویر، لاہور۔ سارہ خالد، راول پنڈی۔ شہریار ملک، لاہور۔ عائشہ رضا، کراچی۔ سعد خالد ظفیر، قلعہ دیدار سنگھ۔ رجا سہیل، پشاور۔ شیخ علی وارث، اوکاڑہ۔ عائشہ مجید، عشرہ امین، فاطمہ بیگ، لاہور۔ محمد عادل، واہ کینٹ۔ عفان عثمان، شیخوپورہ۔ فاطمہ نصیر، راول پنڈی۔ شمائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میاں والی۔ فاطمۃ الزہرہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد ثوبان سعید، صفی اللہ سعید، محمد سارم سعید، لاہور۔

آئیے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 ستمبر 2012ء ہے۔

نام ________ مقام ________

میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ ________

____

____

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

مہینے کے آخری دن

"مالک! دودھ لے لیجیے۔" اپنے ملازم کی آواز نے سیٹھ خالد واجدی کو خیالات کی دُنیا سے باہر نکالا۔ انہوں نے چونک کر اپنے بوڑھے ملازم کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے شینخو! آپ دودھ میز پر رکھ دیں میں پی لیتا ہوں۔" وہ بولے۔

سردی اپنے عروج پر تھی۔ سرِ شام ہی کالے بادلوں اور تیز ہوا کے جھکڑوں نے سردی کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ تیز ہوا کے بے رحم اور سرد تھپیڑے جب جسم سے ٹکراتے تو سردی ہڈیوں تک اترتی محسوس ہوتی تھی۔ کمرے کی فضا باہر سے بالکل مختلف تھی۔ ہیٹر کی وجہ سے سردی کی شدت میں کمی ہو گئی تھی۔ سیٹھ خالد واجدی اپنے بستر پر بیٹھے تھے کہ اچانک ان کا ملازم شینخو دودھ کا مگ لیے اندر داخل ہوا۔ رات کو سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ پینا سیٹھ خالد واجدی کی برسوں سے عادت تھی۔ سردی ہو یا گرمی وہ دودھ ضرور پیتے تھے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ گرمیوں میں دودھ ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہوتا تھا۔

"مالک! دودھ آپ گرم گرم ہی پی لیجیے۔ اگر دودھ ٹھنڈا ہو گیا تو مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا مزہ خراب ہو۔" شینخو بابا مسکراتے ہوئے بولے۔

"کتنے پُرسکون ہیں شینخو بابا، کتنے خوش نظر آ رہے ہیں۔ ایسے نظر آتے ہیں کہ جیسے دُنیا بھر کا سکون اور خوشیاں ان کے دل میں سمائی ہوں۔" اور ایک میں ہوں کہ......" شینخو بابا کو دیکھتے ہوئے سیٹھ خالد واجدی نے سوچا۔

شینخو بابا ان کے ہاں برسوں سے ملازم تھے۔ سیٹھ خالد واجدی اس وقت چند برس کے تھے جب سیٹھ خالد واجدی کے والد عارف واجدی نے شینخو کو اس گھر میں ملازم رکھا تھا۔ شینخو نے اپنی وفاداری، دیانت اور محنت سے کام کرنے کی وجہ سے جلد ہی عارف واجدی کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ شینخو شہر سے دُور ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کے بیوی بچے اور والدین گاؤں ہی میں رہتے تھے۔ سیٹھ عارف واجدی نے بہت کہا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں اور والدین کو گاؤں سے کوٹھی میں لے آئے، لیکن شینخو کا ایک ہی جواب تھا۔

"مالک! میری ماں جی کو اپنے گاؤں کی گلیوں اور کھیت کھلیانوں سے بے حد محبت ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ ماں جی کو چھوڑ کر بھلا میرے بیوی بچے کیسے آ سکتے ہیں۔"

مہینے بعد جب شینخو کو تنخواہ ملتی تو وہ تین دن کی چھٹی لے کر گاؤں چلا جاتا۔ گاؤں جاتے ہوئے شینخو کی خوشی دیدنی ہوتی۔

سیٹھ عارف واجدی کی وفات کے بعد جب اُن کے اکلوتے وارث سیٹھ خالد واجدی نے گھر بار سنبھالا تو سیٹھ خالد واجدی نے شیخو کو ان کی ملازمت پر برقرار رکھا تھا۔

''ٹھیک ہے شیخو بابا اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو لائیے دودھ مجھے دے دیں میں ابھی پی لیتا ہوں۔'' سیٹھ خالد واجدی بولے۔

''یہ ہوئی نا بات......'' شیخو بابا بچوں کی طرح خوش ہو کر بولے اور گرم گرم دودھ کا گلاس انہیں پکڑا دیا۔

''واہ بھئی واہ مزہ آ گیا......'' سیٹھ خالد واجدی نے جیسے ہی گرم گرم دودھ کی چسکی لی وہ پکار اٹھے ''شیخو بابا آپ نے تو کمال کر دیا۔ اتنا مزے دار دودھ میں نے آج تک نہیں پیا، شیخو بابا آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

''مالک! شرمندہ کرتے ہیں بھلا شکریہ کس بات کا'' شیخو بابا بولے۔

''شیخو بابا! آپ کھڑے کیوں ہیں بیٹھ جایئے۔'' شیخو بابا ان کے پلنگ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''شیخو بابا! میں بہت پریشان ہوں۔'' سیٹھ خالد بولے۔

''کک...... کیا کہا...... مالک...... آپ پریشان ہیں......'' شیخو بابا یہ سن کر دھک سے رہ گئے۔

''ہاں شیخو بابا! میں بہت پریشان ہوں......'' سیٹھ خالد واجدی کمرے کی چھت کو گھورتے ہوئے بولے۔

''اس پریشانی کا شکار میں برسوں سے ہوں۔ آج کل مہینے کے آخری دن چل رہے ہیں نا۔ بس میری پریشانی انہیں دنوں میں ہوتی ہے۔''

''مالک! وہ پریشانی کیا ہے؟''

''وہ روپوں کی پریشانی ہے......''

''کیا!!......'' شیخو بابا انہوں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے سیٹھ خالد واجدی کی طرف دیکھا۔

''مالک! یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بھلا...... بھلا...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ کا شمار ماشاء اللہ شہر کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے آپ تین عدد کپڑے کی فیکٹریوں کے مالک ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ آج کل آپ کا کاروبار بھی کافی اچھا جا رہا ہے۔ تو پھر آپ کو روپوں کی پریشانی کیسے ہوسکتی ہے۔''

''شیخو بابا! آپ کی تمام باتیں درست ہیں۔ مجھے روپوں کی پریشانی ہے اور یہ پریشانی مجھے مہینے کے آخری دنوں میں ہوتی ہے، جس طرح ایک تنخواہ دار مہینے کے آخری دن بڑی تنگی سے گزرتے ہیں شیخو بابا اس طرح مجھ پر مہینے کے آخری دن بڑی تنگی سے گزرتے ہیں۔ کیوں کہ جن پارٹیوں کو ہم مال دیتے ہیں وہ ہمیں رقم مہینے کی پہلی تاریخوں کو دیتی ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ مہینے کے آخری دنوں میں مجھے یہ پریشانی نہ ہو۔ اس کے لیے میں نے کئی دُوسری کمپنیوں کے شیئرز بھی خریدے، لیکن یہ پریشانی پھر بھی ختم نہیں ہوئی۔ آج کل بینک میں میرے صرف چند لاکھ روپے پڑے ہیں۔ شیخو بابا آپ بھی تنخواہ دار ہیں، آپ کو بھی تو مہینے کے آخری دنوں میں اس پریشانی سے دو چار ہونا پڑتا ہو گا؟'' سیٹھ خالد واجدی نے سوالیہ نظروں سے شیخو بابا کی طرف دیکھا۔

''نہیں سیٹھ صاحب مجھے آج تک یہ پریشانی نہیں اٹھانا پڑی......'' شیخو بابا مضبوط لہجے میں بولے۔

''کیا!!!؟'' اب حیران ہونے کی باری سیٹھ خالد واجدی کی تھی۔

''یہ...... یہ...... کیسے ہوسکتا ہے؟''

''مالک! یہ اس لیے ہوتا ہے کہ میں نے اپنے والد کی وہ ایک بات پلے باندھ لی تھی جو انہوں نے مجھے اس وقت کہی تھی جب میں گاؤں سے شہر نوکری کی تلاش میں آ رہا تھا۔ میرے ابا جی نے کہا تھا۔

''شیخو پتر! آج سے گویا تم اپنی عملی زندگی شروع کر رہے ہو۔ اگر تم اپنی زندگی چین وسکون سے گزارنا چاہتے تو میری ایک بات پلے سے باندھ لو کہ اپنی آمدنی کے مطابق اپنے اخراجات رکھنا، تم ایسا کرو گے تو مشکلات کا شکار نہیں ہو گے، شیخو پتر جو آدمی دو روپے خرچ کرنے کی طاقت رکھتے ہوئے ایک روپیہ خرچ کرے وہ کبھی مالی بحران کا شکار نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے ابا کی یہ بات گرہ سے

باندھ لی اور اب الحمدللہ میرے لیے مہینے کے آخری اور شروع کے وقت دن برابر ہوتے ہیں۔" بابا بولتے چلے گئے۔ سیٹھ خالد واجدی انہیں حیرت میں گم دیکھتے جا رہے تھے۔ کتنے ہی لمحے گزر گئے کہ وہ شیخو بابا کو دیکھتے رہے۔ پھر اچانک وہ پلنگ سے اٹھ کر کمرے میں رکھے فون کی طرف بڑھے۔ پھر وہ کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔

"آصف سلیمان! میں نے جو تمہیں کل نئی گاڑیاں خریدنے کے لیے کہا تھا وہ آرڈر منسوخ کروا دو اور ہاں میرا جو اپنے گھر والوں کے ساتھ پیرس شاپنگ کے لیے جانے کا ارادہ تھا، وہ بھی کینسل کر دو۔"

دُوسری طرف موجود اپنے سیکرٹری کی بات سنے بغیر سیٹھ خالد واجدی نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ شیخو بابا کی طرف مڑے تو اُن کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اُن کی مسکراہٹ پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔

"شیخو بابا! آپ کا بہت بہت شکریہ مہینے کے آخری دنوں کی پریشانی سے بچنے کے لیے آپ نے مجھے بہت ہی پیارا نسخہ بتایا ہے۔ اور...... اور میں نے اس نسخہ پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ اب میں بھی آپ کی طرح ان شاء اللہ مہینے کے آخری دنوں میں کبھی پریشان نہیں ہوں گا۔"

اُن کو مسکراتے دیکھ کر شیخو بابا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

ٹلہ جوگیاں

مورخین کا خیال ہے کہ آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے آریہ قوم ترکمانستان سے کوہ ہمالیہ کے شمالی اور مغربی دروں کی راہ سے پنجاب میں آئی تھی اور چونکہ پنجاب کا پہلا پڑاؤ جہلم ہے۔ اس لیے اکثر مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آریہ قوم کا پہلا پڑاؤ وادیٔ جہلم میں تھا۔ اس قوم کی مقدس کتاب "رگ وید" کے بیشتر اشلوک اور منتر دریائے جہلم کے کنارے وادیٔ جہلم میں لکھے گئے تھے۔ یہ قوم فطری مظاہر چاند، سورج اور ستاروں کو دیوتا مانتی اور ان کی پرستش کیا کرتی تھی۔ ان کے مذہبی رہنماؤں نے سورج دیوتا کی پوجا کے لیے ٹلہ کو ایک موزوں مقام سمجھ کر منتخب کیا تھا۔

ٹلہ جوگیاں ضلع جہلم کا ایک خوب صورت تاریخی مقام ہے۔ یہ جہلم سے مغرب کی جانب براستہ دینہ ۲۰ میل (۳۵ کلومیٹر) کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سطح زمین سے ۳۲۰۰ فٹ بلند ہے۔ یہ جہلم کا ایک پُرفضا مقام ہے۔ ٹلہ جوگیاں، جوگیوں کا ایک مشہور استھان ہے۔ اس سے پہلے یہ آفتاب پرست آریاؤں کا مرکز رہ چکا ہے۔ ایک دور میں بدھوں کا زور رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ٹلہ جوگیاں قبل مسیح ہی سے ایک خاص شہرت کا حامل رہا ہے۔ اسے "کوہ بالناتھ" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔

یہاں سے گردونواح کا نظارہ انتہائی دلفریب ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے قبل یہ ہندوؤں کا قدیم مذہبی مقام تھا۔ موجودہ وقتوں میں یہ ٹلہ گورکھ ناتھ، ٹلہ جوگیاں یا صرف ٹلہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سکھ مذہب کے روحانی پیشوا بابا گورونانک سولہویں صدی کے شروع میں یہاں آئے اور ان کی بنائی گئی یادگار آج بھی یہاں موجود ہے۔ راجہ بھرتھری بھگت اور رانجھا نے یہاں آکر جوگیوں کی تعلیمات حاصل کیں اور پتھر کے جس چبوترے پر اپنے کانوں میں بالیاں ڈلوائیں وہ آج بھی یہاں موجود ہے۔

مغل دور میں نورالدین جہانگیر کشمیر جاتے ہوئے یہاں قیام کرتا اور اس علاقے کی قدرتی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ یہ مقام موسم کے اعتبار سے سردیوں میں سرد اور گرمیوں میں گرم ہے۔ یہاں اوسط سالانہ بارش ۴۸ سے ۴۹ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ یہاں ایک جنگل بھی ہے، جس میں پھلاہی، کیکر، کہو اور جھاڑیاں بکثرت موجود ہیں اور بلندی پر چیڑ کے درخت بھی نظر آتے ہیں۔ ٹلہ اور اس کے گردونواح کے اس جنگل میں خوب صورت جانور اور پرندے پائے جاتے ہیں۔ جن میں اڑیال، بھیڑیے، جنگلی بلیاں، لومڑی، چکور اور سیاہ رنگ کے تیتر خاص طور پر پائے جاتے ہیں۔ یہی وہ ٹلہ ہے جہاں راجہ پورس نے سکندرِ اعظم سے پنجہ آزمائی سے پہلے اپنا ہیڈکوارٹر بنایا تھا۔ برطانوی راج تک ٹلہ جوگیاں ایک قابلِ دید، دلفریب اور خوش گوار مقام تھا۔ وہاں آٹھوں پہر چہل پہل اور رونق ہوا کرتی تھی۔

قیامِ پاکستان سے قبل ٹلہ جوگیاں میں بیساکھ کے مہینے میں ہر سال میلہ لگتا تھا۔ اپنی پختگی کی وجہ سے بغیر دیکھ بھال کے ہزاروں سال سے تعمیر شدہ عمارتیں ابھی تک بدستور کھڑی ہیں۔ اس تاریخی مقام کی آپ کو ضرور سیر کرنی چاہیے۔

(محمد خلیل چودھری، دینہ)

سے کام لیا تو خون دونوں طرف سے بہے گا۔"

☆......☆......☆

قرار دادِ پاکستان کی منظور کے ایک سال بعد مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مدراس میں ہوا۔ سفر کے دوران قائداعظم کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ اجلاس کے بعد چند دن کے لیے اوٹاکمنڈ چلے گئے۔ لگ بھگ 80 میل کا یہ پہاڑی سفر موٹر کار کے ذریعے طے کیا گیا، اس لیے دیہاتیوں نے جگہ جگہ روک کر استقبال کیا۔ اس دوران سو سوا سو کی آبادی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں لوگوں نے چائے کی دعوت کی۔ لوگوں کی ضد تھی کہ قائداعظم گاڑی سے اتر کر دیہاتیوں سے خطاب کریں۔ قائداعظم راضی ہوگئے۔ جب چائے پی جا رہی تھی تو اس تقریب سے کچھ دُور نو دس سال کی عمر کا ایک لڑکا "مسلم لیگ زندہ باد...... قائداعظم زندہ باد...... لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے لگا رہا تھا۔ بچے کے بدن پر پھٹے پرانے چیتھڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ قائداعظم نے جب یہ دیکھا تو میزبان سے کہا کہ اس لڑکے کو میرے پاس لایا جائے۔ جب لڑکا قائداعظم کے پاس لایا گیا تو وہ سہم گیا۔ قائداعظم نے جب اُسے پیار سے اپنے پاس بٹھایا تو اُس کی ہمت بندھی۔ قائداعظم نے اس سے پوچھا: "تم نعرے لگاتے ہو کہ لے کے رہیں گے پاکستان، مگر کیا تم جانتے ہو کہ پاکستان کس چیز کو کہتے ہیں؟" اس معصوم بچے نے بھولے بھالے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا تو سب کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس سے ہمت پا کر اُس نے جواب دیا "آپ جتنا تو نہیں جانتا۔ جس قدر میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں مسلمان زیادہ بستے ہیں وہاں مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے۔" قائداعظم نے اُسے تھپکی دیتے ہوئے کہا: "شاباش! لاہور کی قرار داد کی اس سے بہتر
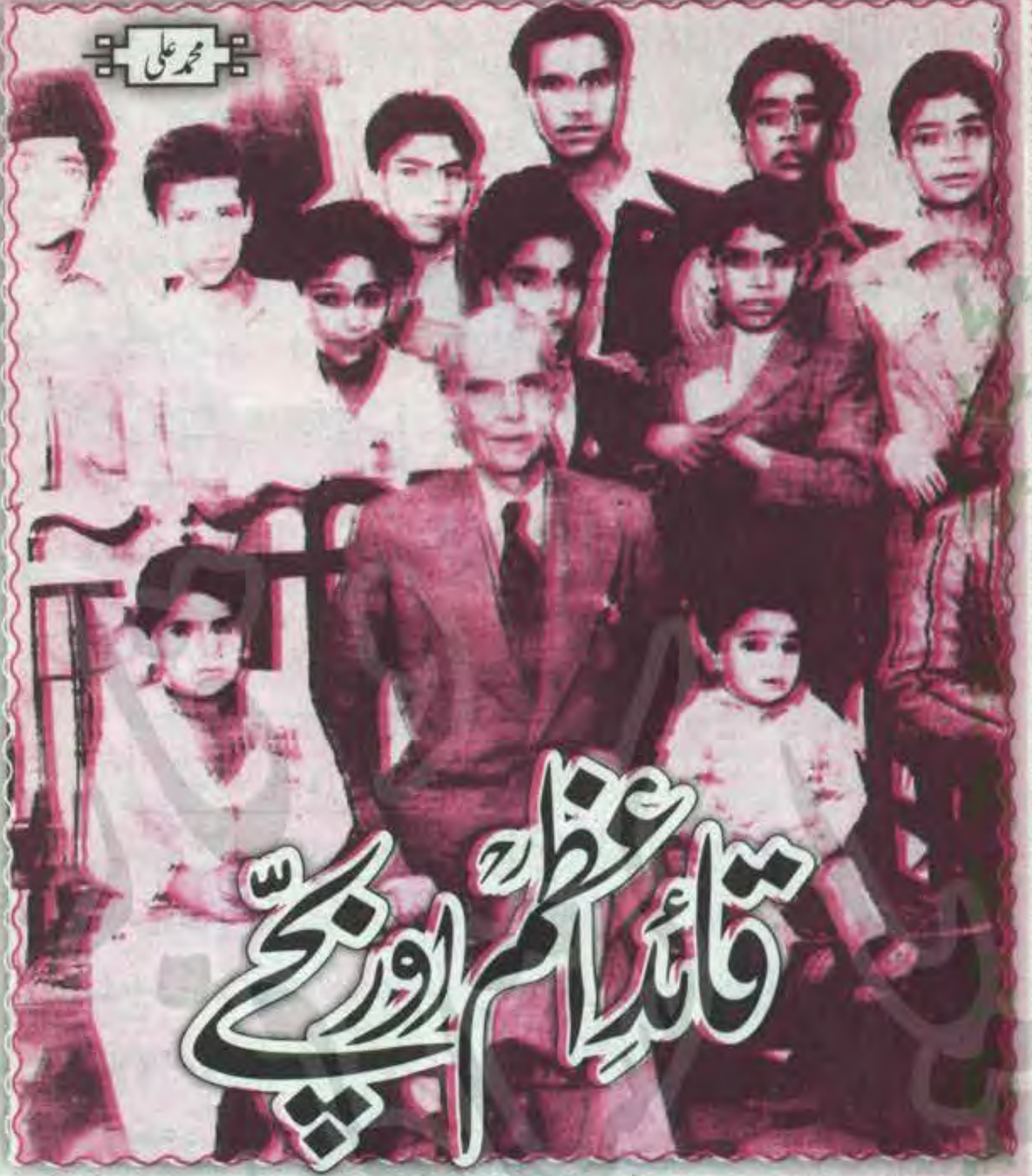
قائداعظم کے سیکرٹری مطلوب الحسن سید کہتے ہیں: "میں لاہور کی قرار داد منظور ہونے کے چند مہینے بعد ایک دن بمبئی کی محمد علی روڈ کے کنارے کنارے پیدل چلا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نو دس سال کے ایک لڑکے نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ لڑکا خون دیکھ کر رونے لگا۔ وہاں سے ایک اور مسلمان نوجوان گزر رہا تھا۔ اُس نے ناراض ہوتے ہوئے اُس لڑکے سے کہا: "مسلمان کا بچہ ہو کر ذرا سا خون بہہ جانے پر روتا ہے۔" بچے نے کہا: "میں اس لیے نہیں روتا کہ خون نکل آیا ہے بلکہ اس لیے روتا ہوں کہ یہ خون ضائع جا رہا ہے۔ اس خون کو تو میں نے پاکستان حاصل کرنے کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔" مطلوب الحسن سید نے جب یہ واقعہ قائداعظم کو سنایا تو ان پر بہت اثر ہوا۔ انہوں نے فرمایا: "اگر ہمارے مخالفوں کو عقل آ گئی اور ان کی نیتوں میں خرابی نہ ہوئی تو ان شاء اللہ ایک قطرہ بھی خون بہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اگر انہوں نے ضد

اور کوئی وضاحت نہیں ہو سکتی۔'' قائداعظم جب اوٹا کمنڈ پہنچے تو انہوں نے کہا: ''مطلوب! حیرت ہے۔ اس جگہ کوئی اخبار آتا ہے نہ اُن دیہاتیوں کے پاس ریڈیو ہے۔ تقریریں بھی نہیں ہوتیں اور وہ لڑکا ایسی مجلسوں میں بھی نہیں بیٹھتا۔ پھر اُس بچے کے ذہن میں پاکستان کے بارے میں اتنی صحیح تعریف کیسے آ گئی۔'' پھر قائداعظم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور کہا: ''اب پاکستان کو بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔''

☆......☆......☆

1943ء کی بات ہے، قائداعظم کوئٹہ میں تھے۔ مختلف لوگ اُن کی دعوتیں کر رہے تھے۔ مشہور دانش ور سر عبدالقادر بھی کوئٹہ میں ہی تھے کہ ایک دن ایک دعوت میں سر عبدالقادر اور قائداعظم ایک ہی جگہ بیٹھے تھے۔ قائد اور وائسرائے لارڈ لنلتھگو کی ملاقاتوں کی بات چھڑ گئی۔ قائد نے بتایا کہ ایک دن وائسرائے نے اُن سے یہ کہا کہ اگر وہ پاکستان بنانے کی ضد چھوڑ دیں تو وائسرائے ہندوؤں کو منا لے گا اور مسلمانوں کو بہت سی رعائتیں بھی دلا دے گا۔ قائداعظم نے اُسے کہا کہ وہ اس بات کا جواب اگلی ملاقات میں دیں گے۔ چند دن بعد قائداعظم جب پھر ملاقات کے لیے گئے تو ایک چیز اپنی جیب میں ڈال کر وائسرائے کے پاس لے گئے۔ پچھلی ملاقات کے سوال کی باری آئی تو قائداعظم نے ایک ریشمی رومال جیب سے نکال کر وائسرائے کے سامنے رکھ دیا، جس پر مسلم لیگ کے مطالبہ کیے ہوئے علاقوں پر مشتمل پاکستان کا نقشہ سبز رنگ کے دھاگے سے بنایا گیا تھا۔ قائداعظم نے وائسرائے کو بتایا کہ یہ گیارہ سالہ لڑکی روہیل گھنڈ کے ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی ہے۔ یہ لوگ پردے کے بہت پابند ہیں۔ گھر میں پردے کی سخت پابندی ہے اس لیے اسے کسی مدرسے میں بھی نہیں بھیجا گیا۔ اس بچی نے نہایت محنت سے یہ نقشہ بنایا اور اس کی آرزو تھی کہ یہ نقشہ خود قائداعظم کی خدمت میں پیش کرے۔ جب قائد دورے پر اس شہر میں پہنچے تو اُس کا باپ قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور قائداعظم سے درخواست کی کہ وہ کچھ وقت نکال کر اُن کے ہاں چلیں جہاں بچی ان کی خدمت میں ایک تحفہ پیش کرنا چاہتی ہے۔ مصروفیات کے باوجود قائد اس بچی کے گھر تشریف لے گئے، وہاں سے یہ تحفہ قبول کیا اور اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔

وائسرائے رومال دیکھ کر بچی کے کام کی تعریف کرنے لگا۔ جب قائداعظم نے اس کی گھریلو زندگی کا حال بتایا تو اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ قائداعظم کہنے لگے: ''آپ سمجھتے ہیں کہ میں لوگوں کو سکھاتا ہوں کہ وہ پاکستان مانگیں، حالانکہ پاکستان بنانے کا خیال تو اس وقت نوجوانوں کی رگ رگ میں سما چکا ہے۔ میں جب یہ بات کرتا ہوں تو صرف اور صرف اپنی قوم کی نمائندگی کرتا ہوں۔''

اس سے وائسرائے پر یہ بات واضح ہو گئی کہ پاکستان کا خیال مسلمان پردہ دار عورتوں اور چھوٹی بچیوں تک کے دلوں کی آواز ہے جسے اب بدلا نہیں جا سکتا۔

☆......☆......☆

1942ء میں قائداعظم آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے ناگپور تشریف لے گئے۔ اس موقع پر اپنی تقریر میں قائداعظم نے گاندھی کی ہٹ دھرمی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا: ''جب میں ناگپور آ رہا تھا تو راستے میں ہر ریلوے اسٹیشن پر لوگ مجھ سے ملتے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میں نے دیکھا کہ نعرے لگانے والوں میں آٹھ نو سال کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی پیش پیش ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ بچہ بڑے جوش و خروش سے نعرے لگا رہا ہے تو میں اس کے قریب گیا اور اُس سے پوچھا: ''یہ جو تم پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا رہے ہو، یہ کیا چیز ہے؟ بچے نے مجھے فوراً جواب دیا: ''مسلمان اپنا الگ گھر بنانا چاہتے ہیں، جس میں سرحد، پنجاب، کشمیر، سندھ، بلوچستان، بنگال اور آسام کے علاقے شامل ہوں گے۔'' میں اس معصوم بچے کی زبان سے پاکستان کے نقشے کی تفصیل سن کر بہت خوش ہوا۔

''ایک آٹھ نو سال کا بچہ تو سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان کیا ہے، لیکن میں حیران ہوں کہ مسٹر گاندھی کی سمجھ میں آج تک یہ معمولی بات بھی نہ آ سکی۔''

ن	ک	ق	م	ٹ	ڈ	ت	و	پ	د
خ	ر	م	ب	ا	ت	ک	ش	ن	ی
ف	و	ج	ی	ج	غ	م	ل	س	ح
چ	ط	غ	ل	ا	ل	ع	ی	ن	ر
ظ	م	و	ق	س	ے	ٹ	ی	ن	ک
ر	ا	ک	ٹ	و	ب	ن	ح	س	ن
ش	م	ی	م	س	ن	م	ی	ج	ر
ہ	ح	ل	س	ف	د	و	ج	و	ع
ی	د	و	ن	ض	و	ی	م	ص	ت
د	ت	گ	ث	ب	ق	آ	ف	ن	ک

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

شہید، میجر، فوجی، گولی، توپ، ٹینک، راکٹ، بندوق، جاسوس، بم

ماسٹر عبدالمجید صاحب اپنی شرافت اور ایمان داری، کی وجہ سے قصبہ شیر پور میں ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ ہر معاملے میں ان کی رائے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ شیر پور مڈل اسکول میں وہ پچھلے بیس سال سے ہیڈ ماسٹر تھے، اس لئے اکثر گاؤں کے بچے اور نوجوان اُن کے شاگرد تھے یا رہ چکے تھے۔ شدید علالت میں بھی ان کی کوشش ہوتی کہ ان کی ہر نماز جماعت کے ساتھ ادا ہو۔

یہ شدید جاڑوں کی ایک صبح کا ذکر ہے جب ماسٹر صاحب اپنے معمول کے مطابق فجر کی نماز کے لیے وظیفہ پڑھتے ہوئے مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔اس رات بارش ہوتی رہی تھی اور اب بھی گھٹا تنی کھڑی تھی جس کی وجہ سے اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنی چھوٹی سی ٹارچ روشن کی ہوئی تھی تا کہ کیچڑ سے بچا جا سکے ۔جگہ جگہ گڑھوں میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا جن میں مینڈک ٹرٹرا رہے تھے۔ جلاہوں کی گلی کی نکڑ پر جگہ بہت تنگ تھی۔ اچانک ان کا پیر پھسلا اور وہ کیچڑ میں گر گئے۔ ماسٹر صاحب چھڑی ٹیکتے ہوئے اٹھے اور کپڑے تبدیل کرنے کے لیے گھر کی طرف واپس ہوئے تا کہ پاک ہو کر دوبارہ مسجد کا رخ کریں۔ ابھی جماعت میں کچھ وقت تھا۔ جب وہ کپڑے بدل کر جانے کے لیے تیار ہوئے تو پھر ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ انہوں نے سوچا کہ آج گھر پر ہی نماز پڑھ لیں۔ ایک لمحے کے لیے پس و پیش ہوا، لیکن وہ پھر مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔

اگلے دن پھر جب وہ فجر کی نماز کے لیے روانہ ہوئے تو اُس دن بھی موسم ابر آلود تھا۔ اتفاق سے ماسٹر صاحب کا اسی جگہ پھر پیر پھسلا اور وہ کیچڑ بھرے گڑھے میں جا گرے۔ ماسٹر صاحب کراہتے ہوئے اٹھے اور لنگڑاتے ہوئے گھر کی طرف واپس ہو گئے۔ وہ جب کپڑے بدل کر تیار ہوئے تو گھٹنے میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے نماز گھر پر پڑھنے کے لیے تخت پر جاء نماز بچھائی۔ تخت پر بیٹھتے ہوئے انہیں خیال آیا کہ برسوں سے ان کی باجماعت نماز قضا نہیں ہوئی آج معمولی سے درد کو عذر بنا کر کیوں باجماعت نماز سے گریز کیا جائے۔ یہ سوچ کر وہ مسجد کی طرف چل پڑے۔ آج وہ ہر قدم دیکھ بھال کر اٹھا رہے تھے۔ مسجد کا رخ کرتے ہی ان کے گھٹنوں کا درد غائب ہو گیا۔

تیسرے دن جب ماسٹر صاحب فجر کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ جیسے ہی جلاہوں کی گلی کی نکڑ پر مڑے تو انہیں سامنے ایک روشنی ٹمٹماتی نظر آئی۔ وہ جب کنویں کے قریب پہنچے جہاں وہ دو بار گرے تھے وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص جس کا چہرہ چادر کے پلو سے ڈھکا ہوا تھا لالٹین پکڑے کھڑا تھا۔ جب ماسٹر صاحب قریب پہنچے تو اس اجنبی نے لالٹین نیچے کر دی تا کہ ماسٹر صاحب کے قدم درست جگہ پڑیں۔

''بہت بہت شکریہ بھائی! میاں تم کون ہو؟'' ابھی ماسٹر

صاحب کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اجنبی مڑ کر اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

آج دن بھر ماسٹر صاحب اس اجنبی کے بارے میں سوچتے رہے۔ وہ کون مہربان شخص تھا۔ اُس کو کیسے معلوم ہوا کہ میں دو دن سے یہاں گر رہا ہوں۔

اگلی صبح جب وہ فجر کی نماز پڑھنے گئے تو موسم کچھ بہتر تھا ۔ نہ جانے کیوں ماسٹر صاحب کا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج بھی وہ اجنبی وہاں کھڑا ہوگا۔ جب وہ نکڑ سے مڑے تو اُن کو حیرت ہوئی۔ آج بھی کنویں کے نزدیک روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ جب وہ کنوئیں کے نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ وہی شخص لالٹین تھامے کھڑا تھا۔ ماسٹر صاحب نے کنویں کی منڈیر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بھائی! تمہارا بہت شکریہ جو تم میرے لئے اتنی زحمت کر رہے ہو،لیکن تعجب ہے میں نے تمہیں مسجد میں کبھی نہیں دیکھا۔ چلو میرے ساتھ مسجد میں با جماعت نماز ادا کرو۔''

'' آپ جائیں، میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔'' اجنبی نے کہا۔

''ٹھہرو! تمھیں آج بتانا ہوگا کہ تم کون ہو؟''

'' آپ جاننا چاہتے ہیں کہ میں کون ہوں تو سنئے، میں شیطان ہوں۔''اجنبی سانپ کی طرح پھنکارا۔

'' شیطان! لیکن شیطان کا کام تو گمراہ کرنا ہے جب کہ تم میری رہنمائی کرتے رہے ہو۔'' ماسٹر صاحب نے حیرت سے کہا۔

''ماسٹر صاحب! انسان کو گمراہ کرنے کے لیے مجھے کئی بھیس بدلنا پڑتے ہیں ، بے شمار حربے استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ خوشامد، لالچ، خوف، دولت، عیش اور تکلیف جیسے جال پھیلانا پڑتے ہیں۔ اب آپ ان تین دنوں کی کہانی سنیں۔آپ ایک نیک انسان ہیں اس لیے میں اور میرے کارندے ایک عرصہ سے آپ کو گمراہ کرنے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے۔ پہلے دن میں نے ہی اس جگہ آپ کو کیچڑ میں گرایا تھا۔ جب آپ گھر واپس گئے اور کپڑے تبدیل کرکے دوبارہ مسجد کا رخ کیا تو میں نے پھر آپ کے دل میں وسوسے ڈالے، لیکن آپ ثابت قدم رہے اور با جماعت نماز کے لیے آ گئے ۔آپ کی اس نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے آدھے گناہ معاف کردیئے۔ دُوسرے دن میں نے پھر آپ کو کیچڑ میں گرایا ۔ اس بار مجھے یقین تھا کہ آپ میرے جال میں پھنس جائیں گے اور دوبارہ مسجد کا رخ نہیں کریں گے، لیکن آپ پھر بھی ثابت قدم رہے اور یوں آپ کے باقی گناہ بھی معاف کر دیئے گئے۔ میرے غصہ کی انتہا نہ تھی۔ پھر میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا کہ اگر میں نے یہی حکمت عملی جاری رکھی اور آپ راہ راست سے نہ بھٹکے تو ممکن ہے آپ کے اہل خانہ کے بھی گناہ معاف ہوجائیں۔ اسی لئے میں نے آپ کو روشنی دکھا کر آپ کو اس ممکنہ نیکی کے انعام سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔'' اتنا کہہ کر شیطان اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

ہم اکثر راہ حق پر چلتے چلتے بھٹک جاتے ہیں، ٹھہر جاتے ہیں کیوں کہ قدم قدم پر شیطان طرح طرح کے جال بچھاتا رہتا ہے۔ صرف وہی لوگ نجات پاتے ہیں جو صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہتے ہیں۔

(مرکزی خیال ماخوذ)

معلوماتِ عامہ

- قرآن مجید کی سب سے بڑی سورۃ ''سورۃ البقرہ'' ہے۔
- قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورۃ ''سورۃ الکوثر'' ہے۔
- قرآن مجید میں کُل چودہ سجدے ہیں۔
- مدینہ منورہ میں سب سے پہلے سورۃ الرحمٰن نازل ہوئی تھی۔
- قرآن مجید میں سب سے زیادہ سورتیں تیسویں پارے میں ہیں۔
- قرآن مجید کی سورۃ توبہ بسم اللہ سے شروع نہیں ہوتی۔
- قرآن مجید کی سورۃ النمل میں بسم اللہ دو مرتبہ آتی ہے۔

(عائشہ ملک، میاں والی)

- حیدرآباد پہلے سندھ کا دارالحکومت تھا۔
- باب الاسلام سندھ کو کہتے ہیں۔
- منگلا ڈیم کو دریائے جہلم پر تعمیر کیا گیا ہے۔
- مصر کا دارالحکومت قاہرہ ہے۔
- ساؤتھ افریقہ کا دارالحکومت کیپ ٹاؤن ہے۔
- دُنیا میں 455 آتش فشاں پہاڑ ہیں۔
- دُنیا میں سب سے زیادہ چائے بھارت میں پائی جاتی ہے۔
- دُنیا میں بلند ترین درخت ریڈوز میں پائے جاتے ہیں۔

(بریعہ سلیم، لاہور)

- بندر جگنو کے قریب نہیں جاتے کیوں کہ وہ انہیں آگ کا شعلہ سمجھتے ہیں۔
- کتے کو جسم کی بجائے زبان پر پسینہ آتا ہے۔
- ہاتھی اور گھوڑا کھڑے کھڑے سو جاتے ہیں۔
- مچھلی کی آنکھیں اس لیے کھلی رہتی ہیں کیوں کہ اس کے پپوٹے نہیں ہوتے۔
- کیکڑے کے دانت اس کے پیٹ میں ہوتے ہیں۔
- کیچوے کے پھیپھڑے نہیں ہوتے وہ جلد کے ذریعے سانس لیتا ہے۔
- برفانی چیتا اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ اپنے وزن سے تین گنا زیادہ وزن اٹھا سکتا ہے۔

(عبدالحنان، لاہور)

- چین میں تقریباً پانچ ہزار دریا ہیں۔

- اسلامی ملکوں میں سب سے زیادہ رقبہ سوڈان کا ہے۔
- شکرا بہت تیز نظر رکھنے والا پرندہ ہے وہ ایک ہزار فٹ کی بلندی سے شکار کو دیکھ لیتا ہے۔
- دُنیا کی بہترین کشادہ سڑکیں جرمنی میں ہیں۔
- دُنیا کا سب سے بڑا پلیٹ فارم سونی پور (بھارت) میں ہے۔

(غلام نبی نوری، کھڈیاں خاص)

- عیدی امین اور شاہ فیصل دو ایسے سربراہ گزرے ہیں جو عید کے دن پیدا ہوئے تھے۔
- برازیل میں سینگوں والے مینڈک بھی پائے جاتے ہیں۔
- بھیڑیا ایک ایسا جانور ہے جو سوتا ہے تو ایک آنکھ بند کر لیتا ہے اور دُوسری کھلی رکھتا ہے۔
- سکندرِاعظم یورپ میں پیدا ہوا۔ ایشیاء میں مرا اور افریقہ میں دفن ہوا۔
- شترمرغ گھوڑے سے تیز بھاگتا ہے۔
- مسجدوں کا شہر ڈھاکہ کو کہا جاتا ہے۔

(عبداللہ مہک، شبقدر)

- فضا میں آواز کی رفتار 1100 فٹ فی سیکنڈ ہوتی ہے۔
- پانی میں آواز کی رفتار 4860 فٹ فی سیکنڈ ہوتی ہے۔
- ولیم گلبرٹ نے بجلی کا نام الیکٹریسٹی رکھا تھا۔
- روشنی کی رفتار 186000 میل فی سیکنڈ ہے۔
- روشنی تازہ صاف پانی میں 700 فٹ کی گہرائی تک پہنچ سکتی ہے۔

(محمد جعفر، گروٹ)

- بارش کا قطرہ گرنے کی رفتار 22 میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔
- دُنیا کی پہلی کتاب جرمنی میں 1451ء میں چھپی تھی۔
- دُنیا کا پہلا بینک اٹلی میں 1808ء میں قائم ہوا تھا۔
- آزاد نظم کی ابتداء فرانس سے ہوئی تھی۔
- مگرمچھ کی اوسط عمر 400 سال ہوتی ہے۔

(محمد احمر خان، جھنگ)

فرض نبھائیں قرض چکائیں

فرض نبھائیں
قرض چکائیں

بستی بستی دیپ جلائیں
نگری نگری پھول اُگائیں
فرض نبھائیں
قرض چکائیں

پاک وطن یہ گھر ہے اپنا
اپنے گھر کو آپ سجائیں
فرض نبھائیں
قرض چکائیں

ہر اِک بچے کے ہاتھوں میں
بستہ کاپی قلم تھمائیں
فرض نبھائیں
قرض چکائیں

اپنا گھر ہے اپنی عزت
اپنی عزت آپ بچائیں
فرض نبھائیں
قرض چکائیں

ظاہر باطن ایک ہو جس کا
آؤ اُس سے ہاتھ ملائیں
فرض نبھائیں
قرض چکائیں

امجد شریف

ٹینک

ٹینک(TANK) ایک موثر و کارآمد جنگی ہتھیار ہے جو دشمن کی صفوں میں گھس کر تباہی مچا دیتا ہے۔ 1915ء میں برطانوی فوج نے پہلی بار ٹینک کا استعمال کیا۔ اُس زمانے میں اسے "LANDSHIP" کہا گیا۔ فرانس والے ٹینک کو "CHARS"

کہتے ہیں، جس کا مطلب ہے ''موت کا پہیہ''، جرمن اسے "PANZER" کہتے ہیں، جس کا مطلب ہے ''ہتھیار'' جب کہ عربی میں اس کو "DABBABA" کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے ''انجن گرفت میں۔'' یوں تو یہ ہتھیار پہلی اور دُوسری جنگ عظیم میں استعمال ہوا، لیکن 1965ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی ہوئی۔ اس جنگ میں 500 بھارتی اور 471 پاکستانی ٹینک تباہ ہوئے۔ کیوں کہ یہ ہتھیار فرنٹ لائن جنگ میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے بری فوج اس کی آڑ میں آگے بڑھتی ہے۔ ٹینک میں ماڈل کے حساب سے مختلف سائز کا دھانہ ہوتا ہے۔ جہاں سے گولا فائر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس پر مشین گن بھی نصب ہوتی ہے۔ ٹینک کے پہیے ایک چین کے اُوپر گھومتے ہیں۔

سی این جی

CNG کے جگہ جگہ پمپ موجود ہیں جہاں گاڑیوں میں نصب سلنڈر بھرے جاتے ہیں۔ سی این جی اصل میں "COMPRESSED NATURAL GAS" ہے۔ جو کوئلے و پٹرول کی طرح فوسل فیول ہے۔ یہ پٹرول کا متبادل ہے جو گاڑیاں چلانے کے لیے بطور ایندھن استعمال ہوتی ہے۔ گو اس کے جلنے سے بھی گرین ہاؤس گیس پیدا ہوتی ہے، لیکن سی این جی، سیسہ اور بینزین (LEAD & BENZENE) سے پاک ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ ماحول دوست ہے۔ اگر پٹرول پر انجن 22 ہزار گرام

کاربن ڈائی آکسائیڈ فی 100 کلومیٹر پیدا کرتا ہے تو سی این جی پر وہی انجن 16275 گرام کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا کرتا ہے۔ قدرتی گیس کو خاص دباؤ پر سی این جی میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اسے خاص دباؤ پر سلنڈروں میں بھرا جاتا ہے۔ 2011ء کے سروے سے معلوم ہوا ہے کہ دُنیا میں 14.8 ملین گاڑیاں سی این جی پر چل رہی ہیں۔ دُنیا کے ٹاپ سی این جی استعمال کرنے والے ممالک میں ایران پہلے، پاکستان دُوسرے، ارجنٹائن تیسرے نمبر پر ہے۔ ان کے بعد برازیل، انڈیا، اٹلی، چین، کولمبیا، ازبکستان اور تھائی لینڈ آتے ہیں۔

ابابیل

ابابیل کو انگلش میں" WIRE TAILED SWALLWO" کہتے ہیں۔ اس کا سائنسی نام"HIRUNDO SMITHII" ہے۔اس کا تعلق جانوروں کی کلاس"AVES" سے ہے۔ یہ خوش قسمت پرندہ ہے کیوں کہ قرآن حکیم کی سورۃ الفیل میں اللہ رب العزت نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس پرندے کی دُم دو شاخی ہوتی ہیں۔ یہ افریقہ کے علاوہ پاکستان اور بھارت میں پایا جاتا ہے۔ افریقی ابابیل جسامت میں چھوٹا جب کہ پاکستانی ابابیل بڑا ہوتا ہے۔ یہ پرندہ عموماً دریاؤں اور نہروں کے نزدیک پل کے قریب گھونسلہ بنا کر رہتا ہے۔ یہ گھونسلے کو محفوظ کرنے کے لیے مٹی کی تہہ اردگرد چڑھا لیتا ہے۔ ابابیل کی لمبائی 14 سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ اس کا بالائی
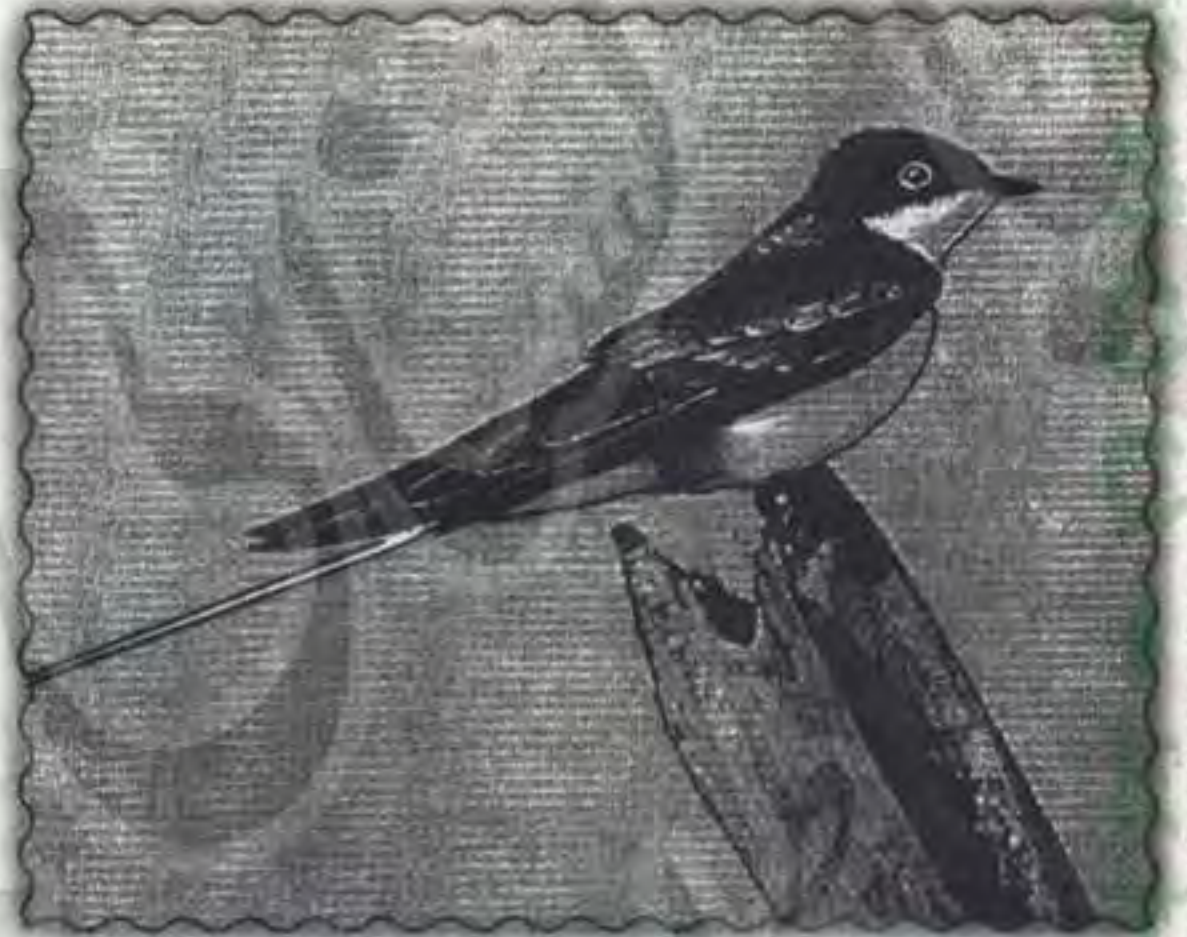
حصہ شوخ نیلا ہوتا ہے جب کہ اڑنے والے پُر گہرے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھیں نیلی مائل تہہ کے اندر ہوتی ہیں۔ مادہ ابابیل جسامت میں چھوٹی ہوتی ہے۔ پاکستانی ابابیل (مادہ) 5 جب کہ افریقن ابابیل (مادہ) 3 سے 4 انڈے دیتی ہے۔ اس پرندے کا سائنسی نام ناروے کے ماہر پروفیسر"CHETIER SMITH" نے تجویز کیا تھا۔

ڈالر

ڈالر (DOLLAR) کئی ممالک کی کرنسی کا سرکاری نام ہے۔ جن میں امریکہ، آسٹریلیا، کینڈا، نیوزی لینڈ، ہانگ کانگ، سنگاپور اور تائیوان شامل ہیں۔ سب سے پرانا ڈالر امریکہ کا ہے۔ 15 جنوری 1520ء سے سکے بننے شروع ہوئے جنہیں ڈالر کہا جانے لگا۔ امریکی ڈالر کو $ کی علامت سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ابتداء میں یہ سکہ چاندی کا ہوا کرتا تھا۔ جو رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ 1965ء تک چاندی کا ڈالر ختم ہوگیا۔ آج ڈالر کے 100 حصے ہیں جنہیں CENT کہا جاتا ہے۔ دُنیا کے اکثر ممالک عالمی سطح پر ڈالروں میں کاروبار اور رقوم کا تبادلہ کرتے ہیں۔ آج ڈالر سکے اور نوٹ دونوں شکلوں میں ملتا ہے۔ یہ نوٹ کاٹن فائبر کاغذ پہ چھاپے جاتے ہیں۔ 1928ء میں ڈالر 17.42 انچ کا (188 ملی میٹر) چھاپا جاتا تھا۔ جب کہ کم مالیت والے نوٹ کا سائز 6.14 انچ (156 ملی میٹر) ہوتا تھا۔ بعد ازاں 0.11 ملی میٹر (0.0043 انچ) کا ڈالر بھی مارکیٹ میں آیا۔ ڈالر کی رنگت سبز

مائل اس لیے رکھی گئی ہے کہ سبز رنگ ٹھہراؤ کی نشاندہی کرتا ہے۔ آج کا ڈالر 2.61 انچ (66.3 ملی میٹر) چوڑا، 6.14 انچ (156 ملی میٹر) لمبا اور 0.0043 انچ (0.109 ملی میٹر) موٹا ہوتا ہے۔ خفیہ چھپائی اور خفیہ ریشے موجودہ کرنسی میں 1991ء سے شامل کیے گئے ہیں۔ ایک خفیہ ریشہ UV روشنی میں سرخ دکھائی دیتا ہے جو ڈالر کے اصلی ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔ 21 اپریل 2010ء سے 100 ڈالر کا نوٹ تبدیل کر دیا گیا ہے۔ پاکستان بھی عالمی سطح پر ڈالروں میں کاروباری معاملات طے کرتا ہے۔ آج کل ایک امریکی ڈالر تقریباً 95 پاکستانی روپوں کے برابر ہے۔

☆......☆......☆

شرافت

استاد: (کلاس میں داخل ہوتے ہوئے) ''آصف یہ تم نے اپنے ساتھ کس کو بٹھا رکھا ہے؟''

آصف: ''سر! یہ میرا چھوٹا بھائی شرافت ہے۔''

استاد: ''وہ تو ٹھیک ہے، مگر تم اسے کلاس میں کیوں لائے ہو؟''

آصف: ''کل آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آئندہ شرافت کے ساتھ بیٹھا کرو۔''

(محمد حذیفہ انوار، جھنگ)

زخمی

ایک شخص جس کا تخلص زخمی تھا۔ وہ کسی کام سے اپنے دوست کے گھر گیا، اُس نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔

''کون ہے؟''

اُس شخص نے جواب دیا: ''جی میں زخمی ہوں۔''

اندر سے آواز آئی: ''ہسپتال آگے ہے وہاں جاؤ۔''

(محمد علی حسن چشتی، ڈیرہ غازی خان)

دانت

مریض ڈاکٹر سے: ''کیا آپ درد کے بغیر دانت نکال سکتے ہیں؟''

ڈاکٹر: ''نہیں۔''

مریض: میں نکال سکتا ہوں......!''

ڈاکٹر: ''وہ کیسے؟''

مریض: (مسکراتے ہوئے) ''ہی ہی...... ہاہا...... ہاہا۔''

(ذیشان احمد صدیقی، کندیاں)

عینک

ایک پاگل (دُوسرے پاگل سے) ''تم عینک لگا کر کیوں سوتے ہو؟''

دُوسرا پاگل: ''کیوں کہ مجھے خواب دھندلے نظر آتے ہیں۔''

(حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

شرط

نعیم: ''آج میں نے وعدہ کیا ہے آئندہ میں کبھی شرط نہیں لگاؤں گا۔''

فہیم: ''لیکن تم ایسا نہیں کر پاؤ گے۔''

نعیم: ''شرط لگا لو۔''

(محمد عزیز چشتی، ڈیرہ غازی خان)

کندھا

ایک بڑی بلڈنگ کے پاس سے بس گزری تو ڈرائیور کے پیچھے بیٹھے ایک بوڑھے نے چھڑی سے ڈرائیور کے کندھے کو ہلا کر پوچھا۔

''کیا یہ عجائب گھر کی بلڈنگ ہے؟''

ڈرائیور: ''جی نہیں، یہ میرا کندھا ہے۔''

(بشریٰ خالق، گوجرانوالہ)

جہاز

دو آدمی جہاز میں سوار ہوئے۔ ایک نے دُوسرے سے کہا۔

''دیکھو تمام لوگ چیونٹیوں کی مانند دکھائی دے رہے ہیں۔''

دُوسرا آدمی: ''ارے بے وقوف یہ لوگ نہیں دراصل چیونٹیاں ہی ہیں کیوں کہ جہاز ابھی ایئر پورٹ پر ہی کھڑا ہے۔''

(اسامہ نوید، اسلام آباد)

چھتری

دُکان دار (گاہک سے) ''اگر آپ صرف ایک بات کا خیال رکھیں تو یہ چھتری کئی سال تک آپ کے کام آئے گی۔''

گاہک: ''مجھے کس بات کا خیال رکھنا ہوگا؟''

دُکان دار: چھتری کو بس ذرا دھوپ اور بارش سے بچا کر رکھے گا۔''

(طوبیٰ یوسف، لاہور)

بھولا بھالو اسکول چلا

بھولا بھالو بستہ لے کر جب اسکول میں پہنچا
پہلے جا کر نام لکھایا پھر وہ پڑھنے بیٹھا

سر پر ٹوپی اور نہ اِس کے پاؤں میں تھا جوتا
پیٹھ پہ بھولا بستہ لادے پہنے کرتا اُلٹا
ساتھ تھے اُس کے گائے چیتا لومڑی بندر گھوڑا
ان کو دیکھ کے اس حالت میں حیراں تھا ہر بچہ

بھولا بھالو بستہ لے کر جب اسکول میں پہنچا
پہلے جا کر نام لکھایا پھر وہ پڑھنے بیٹھا

بھولا سے استاد یہ بولے، پڑھو سبق تم اپنا
ہ سے ہاتھی، ب سے بکری اور ہے ل سے لوٹا
بھولا ہے ہے کرتا رہ گیا اُسے سبق نہ آیا
ماسٹر کو جو غصہ آیا اُسے بنایا مُرغا
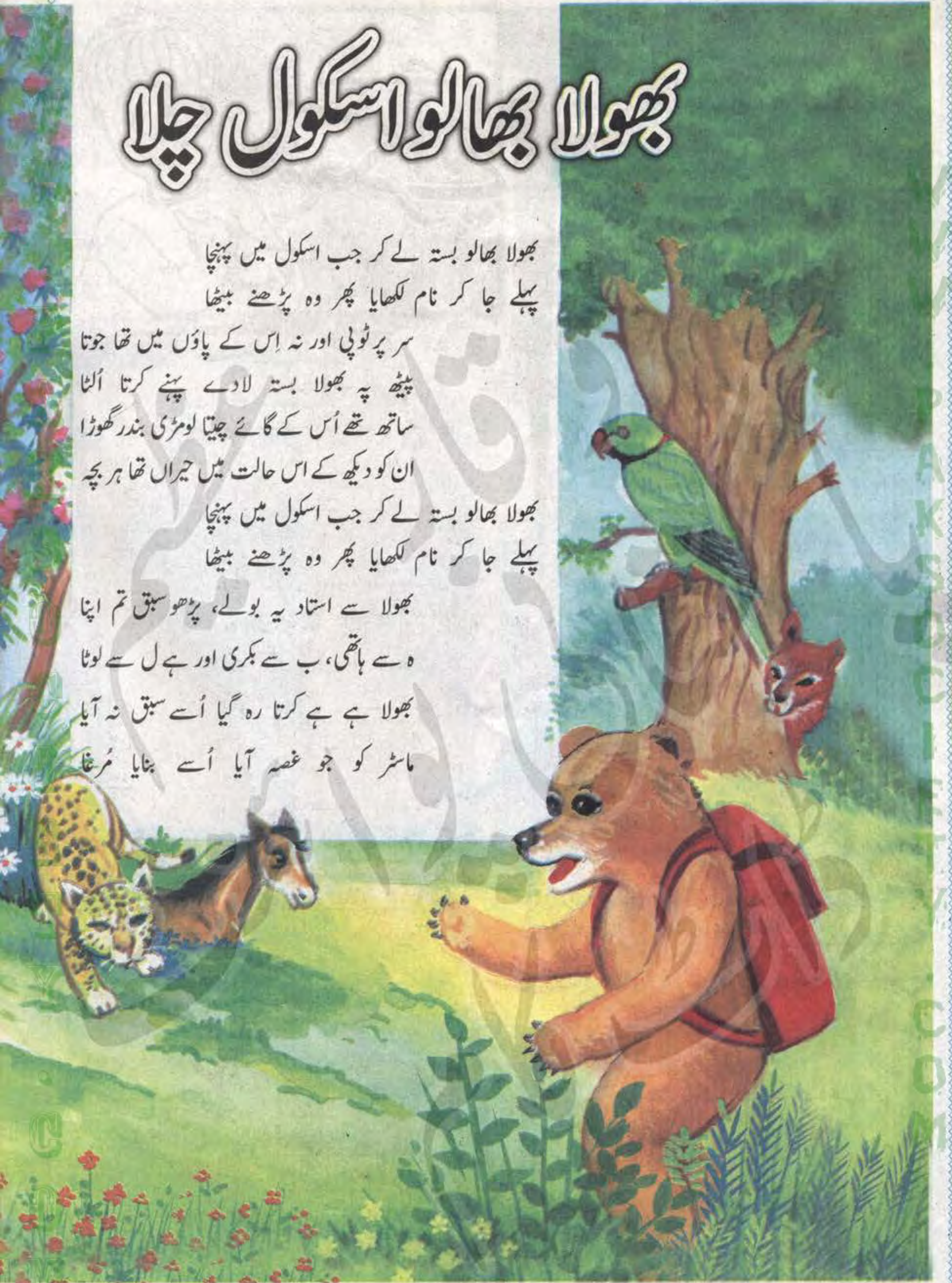
بھولا بھالو بستہ لے کر جب اسکول میں پہنچا
پہلے جا کر نام لکھایا پھر وہ پڑھنے بیٹھا
بچوں نے جب یہ دیکھا تو بولے پیارے بھولا
یاد اگر کر لیتے سبق تو تم کیوں بنتے مرغا
بچوں کی باتوں کو سُن کر بھولا زور سے رویا
بغل میں دابا بستہ اپنا سیدھا گھر کو آیا
بھولا بھالو بستہ لے کر جب اسکول میں پہنچا
پہلے جا کر نام لکھایا پھر وہ پڑھنے بیٹھا
گھر آ کر بھولا نے پہلے اپنا سبق دُہرایا
دُوسرے دن جب مکتب پہنچا اس سے سبق پڑھوایا
بھولا نے جب فَر فَر فَر فَر سبق جو اپنا سنایا
ماسٹر سن کر سبق یہ بولے ، واہ واہ بھولا راجا
بھولا بھالو بستہ لے کر جب اسکول میں پہنچا
پہلے جا کر نام لکھایا پھر وہ پڑھنے بیٹھا
دیکھو بھولا علم کو حیواں کرتے ہیں جب حاصل
وہ بن جاتے ہیں پھر دُنیا بھر میں عالم فاضل
امی بولیں ، ان کو سب ہی کہتے ہیں پھر عاقل
علم نہ حاصل کرنے والے کہلاتے ہیں جاہل
بھولا بھالو بستہ لے کر جب اسکول میں پہنچا
پہلے جا کر نام لکھایا پھر وہ پڑھنے بیٹھا

ضیاء الحسن ضیا

صحرا کا جہاز

کلیم چغتائی

ساحل سمندر پر بڑی رونق تھی۔ بچے ساحل کی گیلی گیلی ریت پر دوڑتے پھر رہے تھے۔ خوانچے والے کھانے پینے کی چیزیں فروخت کر رہے تھے۔ ذرا بڑے لڑکے سمندر کی لہروں سے کھیل رہے تھے۔ بہت سے لوگ ساحل پر بنی چھتریوں کے نیچے بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور کچھ اونٹ والے، بچوں کو اونٹ کی سواری کروا رہے تھے۔

ماہ رخ اپنے بھائی شاہ رخ کے ساتھ ابھی ابھی اونٹ کی سواری کر کے آئی تھی۔ ماموں جان نے اُس سے کہا تھا کہ جب اونٹ پر بیٹھو تو یہ سوچ کر بیٹھو کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے بھی اونٹ پر سواری کی ہے، لہٰذا یہ عمل سنت ہے۔ اس کے علاوہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور سواری کی دُعا پڑھنا نہ بھولنا۔

''بہت مزہ آیا ماموں جان، اونٹ کی سواری کر کے۔'' ماہ رخ خوشی سے بولی۔ ''میرا تو جی چاہ رہا ہے، ایک بار پھر اونٹ پر بیٹھ جاؤں۔''

''بس بیٹے، اب خاصی دیر ہو گئی ہے، واپس چلتے ہیں۔'' ماموں جان بولے اور ممانی جان، ذیشان بھائی اور سعدیہ باجی نے ان کی تائید کی۔ کچھ دیر بعد سب لوگ ماموں جان کی گاڑی میں بیٹھے گھر جا رہے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد ماموں جان بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے کہ ماہ رخ آ کر ان کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئی۔ ماموں جان مسکرائے اور کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر بولے۔

''اونٹ کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بھی کیا ہے۔''

''ماموں جان، آپ کتنے اچھے ہیں۔ بس اب کتاب ایک طرف رکھیے اور مجھے اس جانور کے بارے میں بتائیے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔''

''اللہ نے تو قرآن مجید میں بہت سے جانوروں کا ذکر کیا ہے۔''

''آپ جانتے ہیں پھر بھی ایسا ظاہر کر رہے ہیں کہ جانتے نہیں۔ میں اونٹ کی بات کر رہی ہوں۔'' ماہ رخ نے کہا۔

''اچھا بھئی، بتاتے ہیں ورنہ تم یہیں بیٹھی رات بھر انتظار کرتی رہو گی۔ اونٹ وہ اہم اور خوش نصیب جانور ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا اور جس پر اللہ کے سب سے محبوب بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری فرمائی۔ سورۃ الغاشیہ میں اللہ نے فرمایا: ''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ یہ اونٹ کس طرح تخلیق کیے گئے......'' اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کی نشانیاں تو ہمارے ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، مثلاً یہ اونٹ جسے اللہ نے ٹھیک ان خصوصیات کے ساتھ پیدا فرمایا جن کی صحرائی علاقوں میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ نے پہاڑوں کی مثال دی کہ وہ کس طرح زمین پر جما دیئے گئے، آسمان کس طرح بلند کیا گیا اور زمین کس طرح پھیلا دی گئی۔ دراصل یہ پوری کائنات اللہ کی بے پناہ قدرت کے بے شمار شاہکاروں سے بھری ہوئی ہے۔ زمین پر اور پانی میں بے شمار مخلوقات ہیں، ان میں ہر ایک کا جسم اور اس کا جسمانی نظام اس علاقے کی جغرافیائی اور موسمی ضروریات کے مطابق بنایا گیا ہے، جہاں وہ پایا جاتا ہے۔ اونٹ بھی ایک حیرت انگیز مخلوق ہے۔ انتہائی صابر، بے حد محنتی اور جفاکش مخلوق۔''

”ماموں جان، اونٹ کیا صرف عرب میں پائے جاتے ہیں؟“

”نہیں، اونٹ تو کئی ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ دراصل اونٹ بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہی اونٹ ہے، جس پر آپ نے آج سواری کی۔ اسے عربی اونٹ کہتے ہیں۔ سائنس کی زبان میں اسے ”ڈرومیڈری“ کہا جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک کوہان ہوتا ہے۔ ہزاروں سال پہلے اس اونٹ کے آباؤ اجداد شمالی افریقہ اور عرب کے ریگستانوں میں تھے۔ اس وقت یہ جنگلی اونٹ تھے۔ بعد میں انسان نے انہیں پالتو بنالیا۔ اب یہ جنوب مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔“

”اس کے علاوہ اونٹ کی کون سی اقسام ہیں؟“ ماہ رخ نے پوچھا۔

”اونٹ کی ایک قسم ایسی ہے جس کے دو کوہان ہوتے ہیں۔ یہ ”بیکٹیرین“ کہلاتا ہے۔ اس قسم کے اونٹ سب سے پہلے ساڑھے چار ہزار سال قبل اُس علاقے میں پالے گئے جہاں آج شمالی ایران واقع ہے۔ اب ان کی تعداد کم رہ گئی ہے۔ اونٹ کی کچھ جنگلی قسمیں بھی ہیں جو جنوبی امریکہ میں ملتی ہیں۔“

”اونٹ کی اُونچائی کتنی ہوتی ہے ماموں جان؟“

”ایک کوہان والا اونٹ عام طور پر دو میٹر یعنی سات فٹ اُونچا ہوتا ہے۔ یہ اس کی پیٹھ تک کی اُونچائی ہے۔ مزید ایک فٹ اونچا اس کا کوہان ہوتا ہے۔ اللہ نے اس جانور کے پیر کے جوڑ اور سینے کی کھال بہت سخت بنائی ہے۔ اس لیے یہ زمین پر بیٹھتے یا لیٹتے ہوئے اپنے جسم کا سارا زور اپنے پیروں کے جوڑ اور اور سینے پر ڈالتا ہے۔ سخت کھال کی وجہ سے صحرا کی گرم ریت اس کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی پلکیں بھی لمبی لمبی بنائی تا کہ آنکھیں گردوغبار سے محفوظ رہیں۔“

”ماموں جان، اونٹ صحرا کی گرم ریت پر کیسے چل لیتا ہے اور ایک دن میں کتنا فاصلہ طے کر لیتا ہے؟“

”بیٹے، اللہ نے اونٹ کے پیر خاص طرح کے بنائے ہیں۔ ہر پیر میں صرف دو انگلیاں ہوتی ہیں۔ نیچے سپاٹ اور چوڑے گدے ہوتے ہیں۔ خاص قسم کے پیروں کی وجہ سے اونٹ صحرا میں آسانی سے چلتا ہے۔ عربی اونٹ کی رفتار چھ کلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے اور یہ چوبیس گھنٹے میں تقریباً ایک سو ساٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ دو کوہان والے اونٹ کی رفتار چار کلومیٹر فی گھنٹہ ہے اور وہ ایک دن میں سینتالیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے۔“

”ماموں جان، کیا اونٹ کے کوہان میں پانی کا ذخیرہ ہوتا ہے؟“

”نہیں نہیں!“ ماموں جان نے مسکرا کر کہا۔ ”کوہان میں تو چربی کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ اگر اونٹ کو خوراک نہ ملے تو یہ فالتو چربی اس کی غذائی ضرورت پوری کرتی رہتی ہے۔ کئی دن خوراک نہ ملے تو کوہان چھوٹے ہو کر غائب بھی ہو سکتے ہیں۔“

”ماموں جان، اونٹ تو بڑا زبردست جانور ہے۔“

”اس میں کیا شک ہے۔ دیکھنے میں تو یہ عجیب سا جانور لگتا ہے مگر یہ انسان کے بہت کام آتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی تو اونٹنی پر سفر فرمایا۔ پھر فتح مکہ کے وقت بھی آپ ﷺ اونٹنی پر سوار تھے۔ آپ ﷺ نے جہاں عام جانوروں کا خیال رکھنے کی ہدایت کی ہے وہاں اونٹوں کا بھی خیال رکھنے کا حکم دیا۔ ایک بار آپ ﷺ ایک صحابیؓ کے باغ میں تشریف لے گئے، وہاں ایک اونٹ تھا، اُس نے آپ ﷺ کو دیکھا تو ایسی درد بھری آواز نکالی جیسی آواز، بچے سے جدا ہو جانے پر اونٹنی کی ہوتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے۔ آپ ﷺ اونٹ کے پاس تشریف لے گئے اور اس پر شفقت سے اپنا دستِ مبارک پھیرا تو اونٹ خاموش ہو گیا، پھر آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ اونٹ کس کا ہے؟ ایک انصاری نوجوان آئے، عرض کیا یہ اونٹ میرا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اِس بے زبان جانور کے بارے میں تم اللہ سے ڈرتے نہیں، جس نے تمہیں اس کا مالک بنایا۔ اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور زیادہ کام لے کر اُسے دکھ پہنچاتے ہو۔“ (ابوداؤد)

ماموں جان نے گھڑی دیکھی۔ ماہ رخ سمجھ گئی کہ ماموں جان اب سونا چاہتے ہیں۔ اُس نے ماموں جان کو پیار سے دیکھا اور بولی: ”ماموں جان، آج اونٹ کی سواری میں اتنا مزہ نہیں آیا جتنا مزہ آپ سے اونٹ کے بارے میں حیرت انگیز باتیں سن کر آیا ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

ماہ رخ نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ☆☆☆

مٹھو میاں ان دنوں بالکل فارغ تھے ۔ انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کون سا ''کارنامہ'' سرانجام دیں۔

ایک صبح انہیں گلی گلی گھوم پھر کر پرانا کباڑ جمع کرنے والے کی ریڑھی پر ایک کتاب نظر آئی جس کا عنوان تھا ''شیخ چلی کے کارنامے۔'' مٹھو میاں نے جھٹ پٹ وہ کتاب خرید لی۔تا کہ وہ بھی کوئی ''کارنامہ'' سرانجام دے سکیں۔کتاب لے کر وہ چھت پر جابیٹھے اور بے تابی سے مطالعہ کرنے لگے،لیکن اس کتاب میں تو شیخ چلی کی حماقتوں کے قصے درج تھے ۔دراصل شیخ چلی خوابوں کی دُنیا میں مگن رہنے والے ایک لڑکے کا فرضی کردار ہے جو ہر وقت خیالی پلاؤ پکاتے رہنے کا عادی ہے ۔اس کا ایک قصہ کچھ یوں تھا کہ ایک مرتبہ شیخ چلی اپنی خالہ کے ہاں رہنے گیا۔واپسی پر اُس کی خالہ نے کھانے کے لیے مرغی کے چھ انڈے تحفہ کے طور پر دیے جو شیخ چلی نے ایک پوٹلی میں باندھ کر سر پر رکھ لیے اور چل پڑا، اپنے گھر کی طرف۔راستے میں حسبِ معمول وہ خیالوں کی دُنیا میں کھو گیا اور سوچنے لگا کہ میں ان چھ انڈوں کو کھانے کی بجائے ان سے چوزے نکلواؤں گا ۔وہ چوزے بڑے ہوکر مرغیاں بنیں گی اور ڈھیر سارے انڈے دیں گی۔ میں پھر ان انڈوں سے چوزے نکلواؤں گا۔ وہ چوزے بھی بڑے ہوکر مرغیاں بنیں گی۔ یوں میرے پاس ڈھیر ساری مرغیاں ہوجائیں گی۔ میں ان مرغیوں کو بیچ کر بکریاں لے لوں گا ۔ وہ بکریاں بچے دیں گی تو میرے پاس ایک بہت بڑا ریوڑ ہوجائے گا۔تب میں کسی امیر زادی سے شادی کروں گا ۔ میرے بچے ہوں گے ۔وہ مجھ سے پیسے مانگیں گے تو میں انہیں جھوٹ موٹ میں جھڑک دوں گا۔اب جو شیخ چلی نے اپنے خیالی بچوں کو جھڑکنے کے لیے سر جھٹکا تو سر پر رکھی انڈوں کی پوٹلی زمین پر آگری اور سارے انڈے ٹوٹ کر مٹی میں مل گئے۔تب شیخ چلی کو ہوش آیا اور وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ پاس سے گزرتے کسی راہ گیر نے انڈوں کے ٹوٹنے پر ہم دردی کا اظہار کرتے ہوئے دلاسہ دینے کی کوشش کی تو شیخ چلی منہ بسورتے ہوئے بولے: ''انڈے ٹوٹنے کی کس کو پروا ہے، میرا تو سارا خاندان مٹی میں مل گیا ہے!''

مٹھو میاں کو یہ قصہ بہت پسند آیا۔ خاص کر چند انڈوں سے بکریوں کا بہت بڑا ریوڑ بنانے کی ترکیب تو بہت ہی پسند آئی۔اور انہوں نے گھر میں اعلان کر دیا۔

''اب ہم چوزے پالیں گے......!''

اور پھر شام ہونے سے پہلے پہلے تین عدد ننھے منے روئی کے گالوں جیسے مرغی کے چوزے گھر کے صحن میں کھیل رہے تھے،لیکن

مٹھو میاں نے چوزے کیا پالے، سارے گھر میں ایک بھونچال سا آگیا۔ سب سے زیادہ کم بختی تو مکھیوں کی آئی۔ کسی نے مٹھو میاں کو بتا دیا کہ مرغیاں دانے دنکے کے علاوہ کیڑے مکوڑے بھی شوق سے کھاتی ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ مٹھو میاں کو جونہی کوئی مکھی فرش یا دیوار پر بیٹھی نظر آتی، بڑا سا کپڑا لے کر اس کے پیچھے پڑ جاتے اور اُسے مار کر ہی دم لیتے۔

مٹھو میاں کے نزدیک وہ محض چند چوزے نہیں تھے بکریوں کا بہت بڑا ریوڑ تھا۔ اسی لیے ان کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جا رہا تھا۔

چوزوں کے گھر میں آتے ہی بے چاری مانو بلی کو کان سے پکڑ کر گھر سے نکال دیا گیا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ وہ مٹھو میاں کے چوزوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ایک موٹے سے ڈنڈے کا بھی انتظام کر لیا گیا۔ مانو بلی جونہی آنکھ بچا کر گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرتی۔ مٹھو میاں ڈنڈا تان کھڑے ہو جاتے اور بے چاری بلی منہ بسورتی ہوئی واپس چلی جاتی۔

مٹھو میاں کی چھوٹی بہن روی نے مانو بلی کے ساتھ اس ناروا سلوک پر احتجاج کیا تو مٹھو میاں نے دلیل دی۔

”بلی بہرحال بلی ہوتی ہے۔ نرم و نازک چوزوں کو دیکھ کر کسی بھی وقت اس کی رال ٹپک سکتی ہے۔ اور یہ ہمارے پالتو چوزے ہیں۔ ان کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔“

اگلے ہی دن مانو بلی کا داؤ چل گیا۔ مٹھو میاں ذرا سا غافل ہوئے تو بلی دبے پاؤں چلتے ہوئے آئی اور چوزوں کے قریب گھات لگا کر بیٹھ گئی۔ قریب تھا کہ وہ ایک جھپٹا مارتی اور کوئی چوزہ اچک کر لے جاتی، مٹھو میاں کی نظر پڑ گئی۔ وہ اسی وقت صحن کی طرف بڑھے۔ مانو بلی کی جسارت دیکھ کر غصے سے لال پیلے ہو گئے اور طیش کے عالم میں اپنا جوتا اتار کر مانو بلی کو دے مارا۔ بلی ہشیار تھی۔ دُوسرا اس نے مٹھو میاں کے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔ جوتے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ایک دم تیزی سے جھکائی دے کر پرے ہٹی اور قلانچیں بھرتی چھت پر بھاگ گئی، لیکن چوزے بے چارے جمناسٹک کے داؤ پیچوں سے ناواقف تھے۔ ایک چوزہ جوتے کی زد میں آگیا۔ جس سے اُسے شدید چوٹ لگی تھی۔ وہ چیخ بھی نہ سکا اور موقع پر ہی دم توڑ گیا۔

اس واقعے کے بعد مٹھو میاں اپنے چوزے کے بارے میں اور زیادہ محتاط ہو گئے۔ وہ انہیں زیادہ تر کمرے کے اندر ہی رکھتے، لیکن آخر کب تک۔ روشنی اور تازہ ہوا کے لیے باہر تو نکالنا ہی پڑتا تھا۔ اب بلی کے ساتھ ساتھ کالے کوے بھی تاک میں رہنے لگے، لیکن مٹھو میاں کی کڑی نگرانی کی بدولت ان کا داؤ نہ چل سکا۔ اور اگلے کئی روز خیریت سے گزر گئے۔

اتنے دنوں میں چوزے کچھ بڑے ہو چکے تھے اور ان کے سفید سفید پر بھی نکل آئے تھے۔ ایک شام مٹھو میاں انہیں ٹہلانے چھت پر لے گئے۔ بسنت کی آمد آمد تھی۔ سارا آسمان رنگ برنگی پتنگوں سے سجا ہوا تھا۔ مٹھو میاں کو پتنگ بازی کا بھی بہت شوق تھا، لیکن ان کا یہ شوق صرف پتنگیں لوٹنے کی حد تک محدود تھا۔ اس شام بھی وہ چوزوں کی خبر گیری کے ساتھ ساتھ نیلے نیلے آسمان پر اڑتی

رنگ برنگی پتنگوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ اچانک انہیں ایک طرف سے ایک کٹی ہوئی پتنگ اپنی چھت کی طرف آتی دکھائی دی۔اس کی رفتار اور چال سے لگ رہا تھا کہ وہ مٹھو میاں کی چھت پر ہی گرے گی ۔ مٹھو میاں سب کچھ بھول کر پتنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ پتنگ ہوا کے دوش پر لہراتی ،بل کھاتی اور مٹھو میاں کے دل کو ترساتی چلی آرہی تھی۔جوں جوں پتنگ قریب آرہی تھی مٹھو میاں کی بے تابی اور پتنگ کی طرف دھیان بڑھتا چلا جارہا تھا۔اچانک پتنگ نے ایک غوطہ کھایا اور سیدھی مٹھو میاں کے گھر سے ذرا فاصلے پر واقع چچا رحمانی کے صحن میں جاگری ۔ چچا رحمانی پتنگ بازی کے سخت مخالف تھی ۔ اس لیے مٹھو میاں ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے ۔ چند لمحوں بعد جب وہ پتنگ چھوٹنے کے صدمے سے باہر نکلے تو انہیں اپنے چوزوں کا خیال آیا۔ وہ ایک دم سے چونک کر واپس مڑے لیکن یہاں بھی ایک صدمہ ان کا منتظر تھا۔ عین اسی لمحے ایک چیل ان کے سب سے زیادہ صحت مند چوزے کو اپنے پنجوں میں دبوچ کر فضا میں بلند ہورہی تھی ۔مٹھو میاں ہش ہش ہی کرتے رہ گئے اور چیل صاحبہ چوزہ لے کر اڑن چھو ہوگئیں۔ اور مٹھو میاں ہارے ہوئے کمانڈر کی طرح اپنی باقی ماندہ چوزوں کی فوج لے کر چھت سے نیچے اتر آئے۔ اب انہوں نے تہیہ کرلیا کہ چونکہ زمانہ بہت عیار ہے اور ان کے چوزے بہت سادہ طبیعت کے ہیں اس لیے وہ انہیں کبھی چھت یا صحن کی ہوا نہیں لگنے دیں گے۔اور ان کے جوان ہونے تک ان یتیموں کو ٹوکرے میں ہی چھپائے رکھیں گے۔

چوزوں نے چند دن تک تو یہ قید برداشت کی پھر غالباً بطور احتجاج انہوں نے بیمار ہونا شروع کردیا۔مٹھو میاں اس صورت حال سے بہت گھبرائے ۔جیب خرچ اپنے لیے ہی بہ مشکل پورا ہوتا تھا۔ چوزوں کا علاج معالجہ کہاں سے کرواتے ۔لہٰذا انہوں چوزوں پر عائد پابندیاں نرم کردیں۔اور کمروں کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔

چوزوں کو اتنے دن بعد آزادی ملی تو انہوں نے خوب دل کے ارمان نکالے اور رومی کے ڈریسنگ ٹیبل سے فرش تک اور فرش سے بیڈ تک چھلانگیں لگا کر جمناسٹک کی مشقیں شروع کردیں۔جس کے نتیجے میں رومی کے نئے پرفیوم اور لوشن کی شیشیاں فرش پر گر کر چکنا چور ہوگئیں۔صرف اتنا ہی نہیں ان کے پنجوں کے نشانات بیڈ کی چادر اور تکیے کے غلاف پر کئی نقوش ونگار کا بھی اضافہ کرگئے۔

چادر اور تکیے کے غلاف کی تو خیر تھی کہ دھل کر صاف ہوسکتے تھے لیکن رومی کے پرفیوم اور لوشن کی شیشیاں ٹوٹنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ نتیجتاً مٹھو میاں اور رومی کے درمیان تیسری جنگ عظیم کا آغاز ہوگیا۔ تاہم یہ جنگ صرف جملوں کی فائرنگ کی حد تک محدود تھی۔

رومی جو کئی دنوں سے صبر کیے ہوئے تھی ،پرفیوم اور لوشن کی شیشیاں ٹوٹی دیکھ کر اس کے صبر کا پیمانہ چھلک

"وہ ناسمجھ ہیں آپ تو ناسمجھ نہیں ہیں نا......! آپ میرا نقصان معہ ہرجانہ ادا کردیجئے پھر شوق سے رکھئے اپنے فالتو چوزوں کو......!"

"دیکھوتم نے پھر انہیں فالتو چوزے کہا...... میں کہتا ہوں باز آجاؤ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا......!"

اب مٹھو میاں کی برداشت بھی جواب دے گئی تھی، لیکن اس سے پہلے کہ معاملہ آگے بڑھتا اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتی۔ امی جان نے اقوام متحدہ کا کردار ادا کرتے ہوئے مداخلت کی۔ اور صورت حال جاننے کے بعد فیصلہ سنایا کہ یا تو مٹھو میاں اپنے جیب خرچ سے مبلغ پانچ سو روپے بطور نقصان ادا کریں یا پھر چوزوں کو قصاب سے ذبح کرواکر امی جان کے حوالے کردیں۔ دُوسری صورت میں نقصان کی رقم امی جان رومی کو خود اپنے پاس سے ادا کردیں گی۔ مٹھو میاں کو شام تک سوچنے کی مہلت دے کر امی جان نے عدالت برخاست کردی۔

شام کو سب لوگ کھانے کی میز پر جمع تھے اور للچائی ہوئی نظروں سے میز پر موجود روسٹ کیے ہوئے چوزوں کو دیکھ رہے تھے۔ البتہ مٹھو میاں خاصے افسردہ تھے تاہم وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے امی جان کی دُوسری بات مان کر اچھا فیصلہ کیا ورنہ انہیں ڈیڑھ سو کے چوزے پالنے کی ضد پر اڑے رہنے کے باعث پانچ سو روپے ہرجانہ ادا کرنا پڑتا۔ اور یہ تو وہی بات ہوتی کہ دمڑی کی بڑھیا اور ٹکا سر منڈائی۔

کھانا شروع ہوا تو میز کے نیچے سے میاؤں کی آواز آئی۔ مٹھو میاں نے چونک کر میز کے نیچے جھانکا تو انہیں مانو بلی کی مسکراتی ہوئی شرارت بھری آنکھیں نظر آئیں۔ وہ گویا کہہ رہی تھیں۔

"تم نے زندہ چوزے کھانے نہیں دیے تو کیا ہوا اب روسٹ کیے ہوئے مصالحے دار چوزوں کی ہڈیاں تو میں ہی چباؤں گی......!"

گیا اور وہ غم اور غصے سے پھٹ پڑی۔

"مٹھو بھائی دیکھئے! آپ کے نکمے، نالائق، بے کار اور فالتو چوزوں نے میرے کمرے کا کیا حشر کردیا ہے۔"

"فالتو نہیں، پالتو چوزے......!" مٹھو میاں نے فوراً رومی کی غلطی درست کی

"جو بھی ہیں ......! اب یہ اس گھر میں نہیں رہ سکتے......!" رومی نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ایک آدھ شیشی ٹوٹنے سے کون سی قیامت آگئی ہے۔ یہ ناسمجھ اور معصوم ہیں بے چارے۔ یوں بھی بن ماں باپ کے بچے ہیں۔ تم نے انہیں فالتو چوزے کہہ کر کس قدر دل آزاری کی ان کی، یہ گھر میں نہیں رہیں گے تو کہاں رہیں گے بے چارے۔ دیکھو کسی کو بے گھر کرنا اچھی بات نہیں ہے......!" مٹھو میاں نے ایک بات بنا کر معاملہ ٹالنے کی کوشش کی، لیکن رومی کہاں نچلا بیٹھنے والی تھی۔ ہاتھ نچا کر بولی۔

سنہرے لوگ

غلام حسین میمن

عقیل عباس جعفری

یوں تو پاکستان ٹیلی ویژن نے کئی کوئز شو پیش کیے جو اپنے نئے پن اور بھرپور معلومات کے سبب بے حد مقبول ہوئے۔ ان میں نیلام گھر کا نام نمایاں ہے جو آج بھی مختلف نام سے جاری ہے۔ اس شو میں قیمتی انعامات حاصل کرنے کے لیے آپ کی ذہانت ہی پہلی اور آخری شرط ہے۔

شیشے کا گھر اور نیلام گھر میں متعدد انعامات جیتنے والے ایک دُبلے پتلے نوجوان نے جلد ہی لوگوں کی توجہ حاصل کر لی۔ کچھ کر گزرنے کا عزم لیے یہ نوجوان اپنی مثال آپ تھا۔ خدا نے جو صلاحیت اُسے دی، اُس نے اِس کا بھرپور استعمال کیا۔ اُس نے کئی کوئز پروگراموں میں حصہ لے کر متعدد انعامات جیتنے کے بعد معلوماتی پروگراموں کے لیے سوالات ترتیب دینے شروع کیے۔

یہ آغاز تھا عقیل عباس جعفری کا۔ اُن کا حوالہ آج ایک محقق اور شاعر کا ہے۔ 10 اگست 1957ء کو انہوں نے کراچی میں آنکھ کھولی۔ انجینئرنگ اور صحافت، دونوں شعبوں میں علیٰحدہ علیٰحدہ اداروں سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد 9 سال تک نوجوانوں کو انجینئرنگ کی تعلیم دیتے رہے۔ پھر مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے وابستہ ہو گئے۔

انہوں نے کوئز پروگراموں میں حصہ لے کر ڈیڑھ سو سے زائد ٹرافیاں، شیلڈز اور انعامات حاصل کیے۔ 1981ء میں ٹی وی کے کوئز پروگراموں کے لیے سوالات لکھنے شروع کیے اور تحقیق کا معیار قائم رکھا۔ آصف انصاری نے کراچی ٹی وی مرکز سے اُن کے ایک آئیڈیے پر پروگرام ''سات دن'' شروع کیا، جس میں گزشتہ ہفتے دُنیا کے مختلف ملکوں میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں دل چسپ معلومات متحرک تصاویر کے ساتھ پیش کی جاتی تھیں۔ مرحوم وہاب صدیقی اس پروگرام کے میزبان تھے۔ بعد میں انہوں نے ٹی وی کے ایک اور مشہور پروگرام ''ٹی وی انسائیکلو پیڈیا'' کے لیے بھی کئی پروگرام تحریر کیے۔ ٹی وی کے لیے کئی اور معلوماتی اور دستاویزی سلسلے اس کے علاوہ ہیں۔ بی بی سی لندن سننے والے ان کا ایک اور مشہور پروگرام ''آج کا دن'' نہیں بھولے، جس میں روزانہ کے اہم واقعات کا حال سنایا جاتا تھا۔

وہ زمانہ طالب علمی سے ہی مختلف رسائل اور اخبارات میں معلوماتی مضامین لکھتے رہے ہیں۔ اُن کا یہ سفر بچوں کے رسائل

سے شروع ہوا۔ انہوں نے بچوں کے لیے کئی مفید اور معلوماتی سلسلے تحریر کیے جو پڑھنے والوں کو آج تک یاد ہیں۔ ان میں صفر سے سو تک، مشاغل کی کہانی اور ہے حقیقت کچھ......! شامل ہیں۔ بعد میں صفر سے سو تک اور ہے حقیقت کچھ......! سلسلے کتاب کی صورت میں بھی شائع ہوئے۔

کوئز کے حوالے سے اُن کی مرتب کردہ پہلی کتاب ''قائداعظم کوئز'' ہے جو قائداعظم محمد علی جناح کے صدسالہ جشنِ ولادت کے موقع پر انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے 1976ء میں شائع ہوئی۔ قائداعظم کے حوالے سے ان کی ایک اور کتاب ''قائداعظم کی ازدواجی زندگی'' بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ کئی رسائل میں لکھے جانے والے سلسلوں کے علاوہ ان کی کتابوں کی طویل فہرست ہے جو آج بھی معلومات اور سیاست کے شوقین قارئین کی توجہ کی مرکز ہیں۔ ان میں ایک سال، پچاس سوال، جہانِ معلومات، 366 دن، پاکستان کے سیاسی وڈیرے، پاکستان کی ناکام سازشیں، پاکستان کی انتخابی سیاست، لیاقت علی خان سازش کیس، قومی ترانہ، کیا ہے حقیقت؟ کیا ہے فسانہ اور کون بنے گا کروڑ پتی شامل ہیں۔

اُن کا سب سے اہم اور زیادہ سراہا جانے والا کام ''پاکستان کرانیکل'' ہے جو 2010ء میں منظرِ عام پر آیا۔ بقول ان کے اس کی تحقیق، ترتیب اور اشاعت کے مرحلے تک پہنچنے میں 20 سال کا طویل عرصہ صرف ہوا۔ پاکستان کرانیکل کا مختصر تعارف یوں کرایا جا سکتا ہے کہ جو بھی واقعات آزادی کے بعد پاکستان میں وقوع پذیر ہوئے، اس کا ذکر اس معلوماتی کتاب میں ہے۔ یہ اتنی مستند اور بھرپور کتاب ہے کہ جس نے اسے سرسری بھی دیکھا، اپنے کتب خانے کے لیے ضروری سمجھا۔ یوں ایک مختصر عرصے میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ انہوں نے ضروری اضافے کے بعد دُوسرا ایڈیشن شائع کرایا۔

ان سے قبل مرحوم سید قاسم محمود نے وہ کمی پوری کر دی تھی جو ان سے پہلے رہ گئی تھی۔ ہماری نئی نسل کے ساتھ ساتھ اخبارات و دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے قارئین کے لیے پاکستان پر کوئی انسائیکلوپیڈیا نہیں تھا۔ پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر 1997ء میں سید قاسم محمود نے قوم کو ''انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا'' کا تحفہ دیا۔ اس میں پاکستان کے بارے میں تقریباً تمام معلومات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ علمی حلقوں میں اب کرانیکل کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ ہر ملک کا اپنا الگ کرانیکل ہوتا ہے جس میں ہر سال کے واقعات کو ماہ بہ ماہ ریکارڈ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس شعبے میں پاکستان کے حوالے سے اس کمی کو عقیل عباس جعفری نے پورا کیا۔ پاکستان کرانیکل میں 14 اگست 1947ء کو آزادی کے اعلان سے لے کر نومبر 2011ء (دُوسرا ایڈیشن تک) ہر اہم واقعے کو ریکارڈ میں لایا گیا ہے۔ ضروری تصاویر بھی متن کے ساتھ موجود ہیں۔ کتاب میں موجود مواد کی فوری تلاش کے لیے کتاب کے آخر میں محنت سے تیار کیا ہوا ''انڈیکس'' نہ صرف قاری کی مطلوبہ مواد تک فوری رسائی میں مدد دیتا ہے بلکہ اس طرح قاری اپنا قیمتی وقت بچا کر دُوسرے علمی کاموں میں صرف کر سکتا ہے۔

یوں تو ہر شخص ہی معلوماتی کتابیں مرتب کر رہا ہے اور پبلشرز اسے مارکیٹ میں لا بھی رہے ہیں، مگر ان میں غیر مستند حوالے ہونے کی وجہ سے یہ بجائے معلومات دینے کے، نوجوان اور طالب علموں کی اس شعبے میں حوصلہ شکنی کر رہے ہیں۔ پھر بات ملکی سیاست کے پیچیدہ معاملات کی گتھیاں سلجھانے کی ہو تو اس میدان میں شدت سے ہمارے ہاں اچھی کتابوں کی کمی ہے۔ اس کمی کو کسی حد تک عقیل عباس جعفری، ڈاکٹر صفدر محمود، سید قاسم محمود اور زاہد حسین انجم نے پورا کیا ہے۔

عقیل عباس جعفری شاعر بھی ہیں۔ قومی شاعری اور نعت نگاری پر انہیں ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں اکثر مختلف قومی اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ پاکستان سے ان کی محبت کا اظہار اس شعر میں موجود ہے۔

زندہ رہنے کا ہنر تُو نے دیا
مجھ کو اس دشت میں گھر تُو نے دیا

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن مجید میں صلح حدیبیہ کو کس نام سے پکارا گیا ہے؟

i۔ یوم الفرقان ii۔ فتح مبین iii۔ بیعت الشجرہ

2۔ قرآن مجید کے نزول کا آغاز کس دن سے ہوا تھا؟

i۔ جمعۃ المبارک ii۔ جمعرات iii۔ بدھ

3۔ حضور علیہ ﷺ نے بیعت رضوان کس درخت کے سائے میں بیٹھ کر لی تھی؟

i۔ کھجور ii۔ آم iii۔ کیکر

4۔ لفظ نوح کا مطلب کیا ہے؟

i۔ نوحہ کرنے والا ii۔ عطیہ خداوندی iii۔ رہنما

5۔ کس رکنِ اسلام کو بدن کی زکوٰۃ کہا جاتا ہے؟

i۔ نماز ii۔ روزہ iii۔ حج

6۔ گائے کی اوسط عمر کتنی ہوتی ہے؟

i۔ 15 سال ii۔ 30 سال iii۔ 35 سال

7۔ پاکستان کے قومی ترانے کا دورانیہ کتنا ہے؟

i۔ 2 منٹ ii۔ 1 منٹ 20 سیکنڈ iii۔ 1 منٹ 40 سیکنڈ

8۔ لوہے کا ایٹمی نمبر کیا ہے؟

i۔ 26 ii۔ 30 iii۔ 15

9۔ اٹلی کے کس شہر کو شہروں کا شہر کہا جاتا ہے؟

i۔ روم ii۔ وینس iii۔ میلان

10۔ مرزا ہادی رسوا کی وجۂ شہرت کیا ہے؟

i۔ اداکاری ii۔ ناول نگاری iii۔ گلوکاری

جوابات علمی آزمائش اگست 2012ء

1۔ 6666 آیات 2۔ رضاعی بھائی 3۔ نجیب اللہ 4۔ فنِ کتابت 5۔ 2 ہجری 6۔ 50 سال 7۔ میاں بشیر احمد 8۔ فیصل آباد 9۔ سکندر مرزا 10۔ مخمس

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ محمد بن زبیر، راول پنڈی۔ (200 روپے کی کتب)

☆ سعد عمران، کراچی (175 روپے کی کتب)

☆ محمد عادل خان، واہ کینٹ (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

☆☆ عبدالوہاب، لاہور۔ تسمیہ حسین، اسلام آباد۔ ربیعہ اکرام عزیز، خدیجہ شفیق، لاہور۔ افنان مقبول، گوجرانوالہ۔ فرقان عابد، میاں والی۔ محمد حسین رضا، جوہر آباد۔ بابر نذی، لاہور۔ امجد جاوید، راول پنڈی۔ احمد جواد خان، لاہور۔ عرفان خالد، کلور کوٹ۔ رافعہ ہاشمی، لاہور۔ سعد رشید، بہاول پور۔ ماہ نور تواب، ملتان۔ محمد زبیر ارشد، ملتان۔ حفصہ نعیم، گوجرانوالہ۔ علی معاذ، فیصل آباد۔ ایچ ایم سلیم نور، اوکاڑہ۔ ردا گل، سرگودھا۔ عبدالعزیز، کراچی۔ شاہ زیب ذیشان، لاہور۔ جویریہ فضاء عباسی، پشاور۔ فرخ عباس، تحسین ارشد، اوکاڑہ۔ قراۃ العین حیدر، راول پنڈی۔ ربیعہ اقبال، کراچی۔ محمد عبداللہ طاہری، لاہور۔ عمر نذیر، کراچی۔ شمائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میاں والی۔ عون عثمان، شیخوپورہ۔ اسامہ بن وحید، اسلام آباد۔ پھول پرویز، فیصل آباد۔ تیمور بٹ، ظفر وال۔ ثاقب ضیاء، کوئٹہ۔ عائشہ بتول، ملتان۔ ثناء شہزاد، خانیوال۔ رضا احمد، کراچی۔ دانیال احمد، پشاور۔ راحت اقبال، فرحت اقبال، سیال کوٹ۔ بلال احمد، لاہور۔ نعمان احمد، ساہی وال۔ نورالعین، عروج فاطمہ، احسن ظہیر، لاہور۔ ☆☆

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر 2012ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ____________

مقام: ____________

پتا: ____________

گدھا نامہ

سلمیٰ فاروق

''دھیان سے خود نہیں چلنا، اب چوٹ لگ جاتی تو میرا نام لگنا تھا، گدھے ہو تم۔'' ایک راہ گیر سڑک عبور کرتے ہوئے گاڑی سے ٹکراتے مشکل سے بچا تو گاڑی کا مالک گاڑی سے نکل کر لگا اُسے ڈانٹنے۔

''آہ! پھر گدھے کی بدنامی۔''

حارث نے گاڑی والے کی بات سنی تو آہستگی سے بولا۔ اُس نے گدھوں کے دکھ کو دل پر لیا ہوا تھا۔ ایسا دکھ، جس سے گدھے خود بھی بے خبر تھے۔

وہ ان دنوں ایک مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا اور یہ کہانی اُس وقت شروع ہوئی تھی۔ جب اس کا سکول بدلا تھا۔ پہلا سکول صرف پانچویں تک تھا اور ذہین حارث نے اول پوزیشن لے کر پانچویں جماعت پاس کر لی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں والا گول مٹول سا حارث روز خوشی خوشی پیدل ہی سکول جاتا تھا کیوں کہ سکول گھر سے زیادہ دُور نہ تھا۔

اگلے چند دن تک نئے سکول جانے کی خوشی تو برقرار رہی، لیکن ساتھ وہ ایک اُلجھن میں گرفتار ہو گیا۔ جب ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی حساس بھی ہو تو سوچ وفکر کی عادت خود بخود ہی پڑ جاتی ہے اور حارث ذہین بھی تھا اور حساس بھی۔ روزانہ سکول آتے جاتے اُس کی نظر ایک گدھے پر بھی پڑتی جو ایک چھوٹے سے گھر کے باہر بندھا ہوتا تھا اور گھر کی حالت بتاتی تھی کہ گھر کے مالک کے مالی حالات اُسے صرف ایک گدھا رکھنے کی ہی اجازت دیتے ہیں اور اب اس گدھے نے ہی کام کر کے ان کے مالی حالات کو سنبھالا ہوا ہے۔

''بدتمیز، گدھے آرام سے بیٹھو۔'' استاد نے اس لڑکے کو ڈانٹا جس کی فطرت چین سے بیٹھنے والی تھی ہی نہیں۔

''میں نے تو گدھے کو ہمیشہ آرام سے کھڑے دیکھا ہے۔'' حارث نے استاد کی بات سنی تو اُسے فوراً اُس گدھے کا خیال آیا جس کو وہ قریباً روزانہ ہی دیکھتا تھا، سر جھکائے آرام سے کھڑا گدھا جس کو اپنے آس پاس سے گزرتے لوگوں کی کوئی پروا نہ تھی، اس کا موازنہ حارث اب اپنے اس ہم جماعت سے کر رہا تھا جس کو استاد نے ابھی گدھا کہا تھا۔ کہاں بے حد شرارتی اور اُچھل کود کرنے والا یہ لڑکا اور کہاں وہ شریف سا گدھا۔ حارث کچھ اُلجھ سا گیا۔ ''شاید باقی گدھے ایسے نہ ہوں۔'' وہ اپنی اُلجھن خود ہی سلجھانے لگا۔ پھر ہوا یوں کہ کچھ دنوں بعد ہی اس کی نظر ایک اور گدھے پر پڑ گئی جو ایک ایسے ریڑھے کے آگے جتا ہوا تھا جس پر بہت سا سامان لدا ہوا تھا، اُس پر ایک بندہ بھی بیٹھا ہوا تھا اور گدھا نہایت زور لگا کر اُسے کھینچ رہا تھا جہاں وہ کچھ آہستہ چلتا، ریڑھے پر بیٹھا شخص فوراً اپنے ہاتھ میں پکڑے چابک سے اس کو مارتا اور وہ گدھا اس ظلم پر کوئی احتجاج کیے بغیر چلتا جا رہا تھا۔

''گدھے تو سارے ہی شریف اچھے اور بے ضرر سے ہوتے ہیں پھر یہ بدنام کیوں ہیں؟'' حارث سوچتا ہوا گھر پہنچا اور یہ سوال اپنے ابو کے سامنے رکھا۔

"وہ اس لیے کہ ہمارے یہاں گدھے کو ایک بے وقوف جانور سمجھا جاتا ہے اور جب کوئی ایک بندہ کام کرتا ہے تو دُوسرا اُسے گدھا کہہ کر اپنا غصہ نکالتا ہے۔" ابو نے جواب دیا۔

"لیکن ابو! گدھے کو بے وقوف جانور کیوں سمجھا جاتا ہے؟"

"میرے خیال میں گدھے کو بے وقوف اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ اسے اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھانے پر مجبور کیا جائے تو شاید ہی کبھی اس نے احتجاج کیا ہو۔" ابو کی بات سن کر حارث نے کہا۔

"لیکن ابو یہ تو گدھے کی اچھائی ہوئی نا۔"

"ہاں یہ ہے تو اس کی اچھائی مگر ہم اسے اس کی بے وقوفی سمجھتے ہیں اور تمہیں مزے کی بات بتاؤں امریکہ میں گدھے کو ایک عقل مند جانور سمجھا جاتا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

حارث کے لیے یہ انکشاف خوشی کا باعث تھا۔

"اچھا اب تم سکول کا کام کرو اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔" ابو جان کے کہنے پر پھر حارث سکول کا کام کرنے لگا۔

"ہمارے ہاں گدھے سے اتنا کام بھی لیا جاتا ہے اور پھر اسے اچھا بھی نہیں سمجھا جاتا تو یہ بُرا برتاؤ کیا گدھے کو خود بھی محسوس ہوتا ہوگا؟ اس ناقدری پر اُسے دکھ تو ہوتا ہوگا۔" حارث رات جب سونے کے لیے لیٹا تو یہ نئی سوچ وارد ہوئی تھی۔ اس کا یہ پرانا مسئلہ تھا کہ جب تک اس کی اُلجھن مکمل طور پر سلجھ نہ جاتی اُسے سکون نہ ملتا تھا۔

"اب گدھا تو میرے سوالوں کے جواب دے نہیں سکتا کاش میں خود ہی ایک دن کے لیے گدھا بن جاؤں اور یوں گدھے کی دلی کیفیت کو جان جاؤں۔"

اور پھر اس حساس و ذہین بچے کی یہ معصوم سی خواہش جلد ہی پوری ہوگئی اور وہ گدھا بن گیا، لیکن خواب میں۔ اُس نے محسوس کیا کہ گدھا ہوتے ہوئے اسے بہت سا کام کرنا بُرا نہیں لگ رہا کیوں کہ اسے معلوم ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اسی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہاں جب اس پر بہت زیادہ بوجھ ڈالا جاتا ہے یا جب اُسے مارا جاتا ہے تو اُسے تکلیف بھی ہوتی ہے اور وہ بس یہ سوچ کر رہ جاتا ہے کہ اس پر ظلم کرنے والا انسان اچھا نہیں۔ حارث نے خواب میں یہ بھی دیکھا کہ اس سے اس کے مالک نے سارا دن بہت کام لیا کچھ مارا بھی، لیکن جب شام کو اس کے مالک نے اس کے آگے چارہ رکھا اور پیار سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا تو اس کو بہت اچھا لگا اور اس کی سارے دن کی تھکن دُور ہوگئی۔

"اف گدھا ہونا بھی کتنا مشکل ہے، شکر ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے انسان بنایا ہے۔" یہ بڑبڑاتے ہوئے حارث کی آنکھ کھل گئی۔

"ابھی تو دس بجے ہیں اور جب میں سویا تھا تو اُس وقت نو بجنے والے تھے یعنی میں تقریباً ایک گھنٹہ خواب میں گدھا بنا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنا دل چسپ خواب سنانے کے لیے امی ابو کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ دستک دے کر کمرے میں داخل ہوا۔

"تم ابھی تک سوئے نہیں۔" امی جان اُسے دیکھ کر بولیں۔

"میں سویا تو تھا مگر خواب میں گدھا بن گیا تھا۔"

"خواب میں گدھا، بیٹا تم یہ کیا کہہ رہے ہو" امی جان نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"جب گدھوں کے بارے میں اتنا سوچو گے تو پھر خواب بھی گدھے ہی کے دیکھو گے۔" ابو جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ابا جان! گدھا تو ایک نہایت محنتی اور امن پسند جانور ہے، یہ انسانوں کے کام آتا ہے، کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا پھر بھی انسان اس کو بے وقوف اور کم عقل سمجھتے ہیں، کاش دُوسرے ممالک کی طرح ہمارے ہاں بھی گدھوں کو ان کا صحیح مقام مل جائے۔" حارث کی بات سن کر ابو جان بولے۔

"ایسا اُسی وقت ممکن ہے جب ہم تعلیماتِ اسلامی پر عمل پیرا ہو کر بے زبانوں کے حقوق سے آگاہ ہوں گے۔"

"ابو جان! کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"جی بیٹا! ایسا بالکل ہو سکتا ہے۔"

حارث اس اُمید کے ساتھ سونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھا کہ وہ وقت بہت جلد آئے گا کہ جب ہمارے ہاں بھی گدھے کو ایک بے وقوف جانور کی بجائے عقل مند جانور کا درجہ ملے گا۔

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

رات سے شدید بارش ہو رہی تھی۔ یاسر کے گھر میں مرغیوں کا ڈربہ درخت کے پاس بنا ہوا تھا۔ یاسر کی امی جان نے اُسے کہا کہ وہ باہر جا کر دیکھ کر آئے کہ کہیں مرغیوں کے ڈربہ کی چھت تو نہیں ٹپک رہی۔ یہ کہہ کر وہ گھریلو کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے یاسر کو بلا کر مرغیوں کے ڈربے کے بارے میں پوچھا تو اُس نے فوراً جواب دیا کہ مرغیوں کا ڈربہ بالکل ٹھیک ہے۔ امی جان نے اُس کے کپڑوں اور جوتوں پر نظر ڈال کر اندازہ لگایا کہ یاسر کمرے سے باہر نہیں گیا اور جھوٹ بول رہا ہے کہ مرغیوں کا ڈربہ ٹھیک ہے۔ آپ نے کھوج لگانا ہے کہ امی جان کو کیسے معلوم ہوا کہ یاسر جھوٹ بول رہا ہے۔

اگست 2012ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگایئے" کا صحیح حل: سروش کے دائیں ہاتھ میں 7 روپے اور بائیں ہاتھ میں 5 روپے تھے۔ درج ذیل بچے بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

1۔ رامش علی اعوان، شیخوپورہ۔
2۔ عبدالعزیز، کراچی۔
3۔ علی معاذ، فیصل آباد۔
4۔ محمد بن عامر، وہاڑی۔
5۔ بسمہ حیدر، لاہور۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر 2012ء ہے۔

کھوج لگایئے!

نام: ____________

پتا: ____________

____

رانا محمد شاہد

امپائرنگ کی دُنیا کا افتخار
علیم ڈار
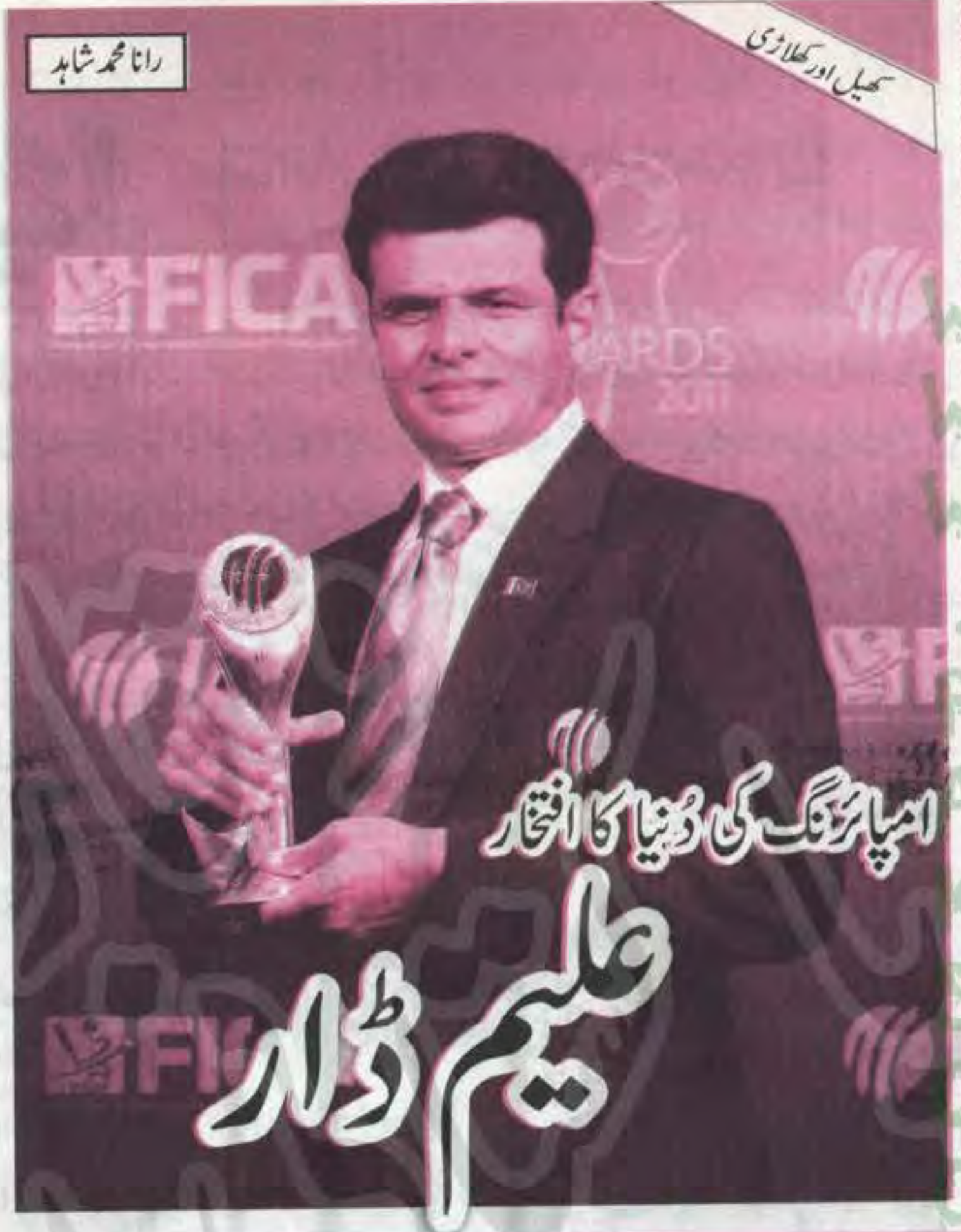
تین بار دُنیا کے بہترین امپائر کا اعزاز حاصل کر کے پاکستان کا نام دُنیا بھر میں روشن کیا۔ جی ہاں پاکستان کے اس عظیم سپوت کا نام علیم ڈار ہے۔

کرکٹ کی تاریخ میں علیم ڈار کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ امپائرنگ میں اپنی بہترین خدمات کے پیش نظر مسلسل تیسری مرتبہ آئی سی سی ایوارڈ آف دی ایئر حاصل کر کے انہوں نے ملک وقوم کا نام فخر سے بلند کیا اور سبز ہلالی پرچم ساری دُنیا میں اُونچا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج پوری قوم کو علیم ڈار پر فخر ہے۔ ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد ان کے کلب پی اینڈ ٹی نے علیم ڈار کے لیے تقریب کا اہتمام کیا اور ان کی تاج پوشی کی۔ دُوسری دفعہ ایوارڈ حاصل کرنے پر یہ تاج پوشی نام ور کرکٹر عمران خان نے کی۔ اس تقریب میں پی سی بی کے چیئرمین سمیت متعدد سابق کرکٹرز نے بھی شرکت کی۔

2011ء میں ہونے والے ورلڈ کپ کے دوران علیم ڈار واحد امپائر تھے کہ جن کے کسی ایک فیصلے کو بھی چیلنج نہ کیا جا سکا۔ مسلسل تیسری بار سال کے بہترین امپائر کا اعزاز حاصل کر کے انہوں نے ملک کا نام روشن کیا۔ سٹیوڈیوس، ای ین گولڈ اور پانچ مرتبہ یہ اعزاز اپنے نام کرنے والے آسٹریلوی امپائر سائمن ٹوفل بھی ڈیوڈ شیفرڈ ٹرافی کے اُمیدواروں میں شامل تھے۔ تاہم ون ڈے اور ٹی 20 میں 100 فی صد جب کہ ٹیسٹ کرکٹ میں 98فیصد درست فیصلوں کا تناسب رکھنے والے پاکستانی سپوت نے کسی دُوسرے کو اپنی مسند پر قابض نہ ہونے دیا۔ علیم ڈار نے تیسری مرتبہ بہترین امپائر کا اعزاز ستمبر 2011ء میں حاصل کیا۔

43 سالہ علیم ڈار نے 13 اگست 2011ء تک کے عرصے میں ورلڈ کپ فائنل سمیت 13 ون ڈے اور 5 ٹیسٹ میچز میں

''میں 2003ء کے ورلڈ کپ میں امپائرنگ کے لیے جنوبی افریقہ گیا ہوا تھا۔ اُس وقت تک میں نے صرف 12 بین الاقوامی میچز میں امپائرنگ کی تھی۔ پاکستان میں میری اکلوتی سات ماہ کی بیٹی جویرہ علیم کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی اور چند دن بعد وہ فوت ہوگئی۔ میری اہلیہ نے یہ سوچتے ہوئے کہ میں خبر سنتے ہی واپس پاکستان آ جاؤں گا اور میرا کیریئر ختم ہو جائے گا، مجھے بیٹی کے بارے میں کچھ نہ بتایا اور فون پر بات چیت کر کے میرا حوصلہ بلند کرتی رہی۔ میری اہلیہ اس وقت شدید دکھ میں بتلا تھی، لیکن میرے کیریئر کے لیے اس نے اپنا دُکھ چھپا کر رکھا اور آج میں بہترین امپائرنگ کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد اس واقعے کو یاد کرتا ہوں تو اپنی اہلیہ کی ہمت کو داد دیتا ہوں۔ مجھے اپنی بیٹی بہت یاد آتی ہے۔ میں شاید اس واقعے کو کبھی نہ بھلا پاؤں گا۔''

یہ اس شخص کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ ہے جس نے

امپائرنگ کرتے ہوئے کئی بار اپنے فیصلوں سے ٹیکنالوجی کو مات دی۔ کسی ٹیم نے ان کا فیصلہ چیلنج کیا تو اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ مضبوط اعصاب اور انسانی آنکھ کی مدد سے درست فیصلے تک پہنچنے کی اس صلاحیت نے نہ صرف دُنیا بھر کے کروڑوں شائقین کو حیران کیا بلکہ علیم ڈار کی عزت و احترام میں بھی اضافہ ہوا۔

علیم ڈار کو ابتداء سے امپائرنگ کا نہیں کرکٹ کھیلنے کا شوق تھا۔ وہ ایک دہائی تک مڈل آرڈر بیٹسمین اور لیگ سپنر کے طور پر فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلتے رہے۔ گریجوایشن کرنے کے بعد الائیڈ بینک میں ملازمت بھی کی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میرے کرکٹ کے شوق کو دیکھتے ہوئے ایک روز پی اینڈ ٹی کے صدر اظہر زیدی نے کہا کہ انڈر 19 کے لیے تمہاری عمر زیادہ ہوگئی ہے۔ اب اگر تم چاہو تو امپائرنگ میں نام پیدا کر سکتے ہو۔ یوں امتحان پاس کرنے کے بعد میں انڈر 19 میں امپائرنگ کرنے لگا۔ پہلے سال ہی مجھے فرسٹ کلاس اور پھر بین الاقوامی میچوں میں امپائرنگ مل گئی۔ علیم ڈار نے 2000ء میں پہلا ون ڈے انٹرنیشنل سپروائز کیا۔ یہ میچ پاکستان اور سری لنکا کے درمیان گوجرانوالہ میں کھیلا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر 32 سال تھی۔ دو برس کے عرصے میں ہی وہ آئی سی سی پینل میں شامل کر لیے گئے۔ 2003ء میں پہلی بار ورلڈ کپ میں ذمہ داریاں نبھائیں۔ پھر اکتوبر میں بنگلہ دیش اور سری لنکا کے مابین سیریز میں پہلی بار ٹیسٹ امپائرنگ کا موقع ملا۔ سخت دباؤ میں کیے ان کے فیصلوں نے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا۔ 6 ماہ کے قلیل عرصے میں وہ آئی سی سی ایلیٹ پینل کا حصہ بن چکے تھے۔ سائمن ٹوفل اور علیم ڈار دیگر سینئر امپائرز کی نسبت کم عمر ہونے کی وجہ سے زیادہ پُراعتماد اور قابلِ اعتماد دکھائی دیئے۔

علیم ڈار کے کیریئر کا بُرا وقت وہ تھا جب وہ ورلڈ کپ 2007ء کے فائنل میں خراب روشنی کے حوالے سے قوانین کے بارے میں ان کی غلط فہمی ان پر بُرا وقت لے آئی۔ جس کی وجہ سے وہ ٹی 20 ورلڈ کپ کے مقابلوں سے معطل بھی رہے۔

علیم ڈار کے تین بیٹے ہیں۔ ایک بیٹے کو قرآن مجید حفظ کروا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مجھے آخرت کے سوا کسی چیز کا خوف نہیں، اچھے اعمال پر یقین رکھتا ہوں۔ اسی لیے اپنے ایک بیٹے کو قرآن مجید حفظ کروا رہا ہوں۔ امپائرنگ کے دوران نماز قضا ہو جائے تو بعد میں ادا کرتا ہوں۔

بچپن کی شرارت کے حوالے سے وہ ایک واقعہ سناتے ہیں۔ ”سکول کے زمانے میں کرکٹ کھیلنے کا بہت جنون تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میچ والے روز چھٹی کی درخواست لکھ کر والد صاحب کے دستخط کر کے سکول بھیج دیتا تھا۔ ایک بار پکڑے جانے پر والد صاحب نے خوب پٹائی کی لیکن پھر میرے شوق کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کرکٹ کھیلنے کی اجازت دے دی۔“ علیم ڈار ایشیاء میں سب سے زیادہ ون ڈے انٹرنیشنل میچ سپروائز کر چکے ہیں۔ جب کہ زیادہ سے زیادہ ٹیسٹ میچز میں ان کا نمبر دُوسرا ہے۔ دو مرتبہ چیمپئنز ٹرافی اور دو مرتبہ ورلڈ کپ کے فائنل میں امپائرنگ کے فرائض ادا کر چکے ہیں۔

امپائرنگ کی دُنیا میں ڈکی برڈ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ڈکی برڈ امپائر ریویو سسٹم کے حامی نہیں۔ ان کے خیال میں اس نظام سے امپائر روبوٹ بن کر رہ گیا ہے اور اس کے اختیارات کو کم کیا جا رہا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ بہت تحقیر آمیز رویہ ہے کہ امپائر ایل بی ڈبلیو قرار دے اور کھلاڑی میدان میں کھڑا ہو کر آپ کی اتھارٹی کو چیلنج کرتا پھرے۔ وہ ایسے عمل کو اچھا نہیں سمجھتے اور اس بات پہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کا سسٹم آنے سے پہلے کرکٹ سے کنارہ کشی اختیار کر چکے ہیں۔ ڈکی برڈ جب تک امپائر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، دُنیا بھر میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ عمران خان، ڈکی برڈ کو اپنا پسندیدہ امپائر قرار دیتے ہیں۔ جب کہ ڈکی برڈ علیم ڈار کو دُنیا کا بہترین امپائر قرار دیتے ہیں۔ وہ سائمن ٹوفل کو بھی اچھا امپائر کہتے ہیں۔ لیکن علیم ڈار کو ان سے کہیں بہتر سمجھتے ہیں۔ علیم ڈار کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ ٹھنڈے مزاج کا حامل، ناپ تول کر فیصلے کرنے والا اور اس حقیقت سے آگاہ کہ وہ کیا فیصلہ کرنے جا رہا ہے۔

کھیل کی دُنیا میں نظم و ضبط کی پابندی اور اعلیٰ ظرفی سے کھلاڑی و امپائر کی عزت و مقام میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک ون

ڈے میچ کے دوران علیم ڈار نے انگلش بولر فلنٹوف کی گیند پر ٹنڈولکر کو وکٹ کیپر میٹ پرائر کے ہاتھوں کیچ آؤٹ قرار دے دیا لیکن بعد میں احساس ہوا کہ گیند بیٹ کی بجائے پیڈ سے ٹکرایا تھا۔ چنانچہ بعد میں انہوں نے اعلیٰ ظرفی کی مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور ٹنڈولکر سے معذرت بھی کی۔ ایسا حوصلہ بھی بہت کم امپائر میں ہوتا ہے۔

کم گو اور اپنے کام پر بھرپور توجہ رکھنے والے اس امپائر نے ناخوش گوار لمحات کو ذہن میں جگہ دینے کی بجائے اپنی نظر پیشہ وارانہ ذمہ داری پر رکھی ہے۔ جس کے صلے میں نہ صرف آئی سی سی کی طرف سے مسلسل تین سال بہترین امپائر کا ایوارڈ ملا بلکہ ٹیموں کے کپتانوں، کھلاڑیوں اور شائقین کی طرف سے عزت و احترام بھی ملا۔

علیم ڈار کا کہنا ہے کہ جدید دور میں امپائرنگ اتنی آسان بھی نہیں۔ ٹیکنالوجی مختلف زاویوں سے لیے گئے ری پلیز کے ذریعے آپ کے ایک ایک فیصلے پر نظر رکھتی ہے۔ ایک عام انسان کا ہر فیصلہ درست ہونا ممکن نہیں، چنانچہ غلطی کا امکان بہر حال موجود ہوتا ہے۔ تاہم میری کوشش ہوتی ہے کہ ذہنی و اعصابی طور پر خود کو مضبوط رکھتے ہوئے انصاف کے تقاضے پورے کر سکوں اور اگر کبھی غلطی ہو جائے تو اس سے سبق سیکھتے ہوئے آئندہ دہرانے سے گریز کروں۔

ان کے مطابق گراؤنڈ میں غیر جذباتی انداز اختیار کرتے ہوئے صرف اپنے کام پر نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ٹیم یا کھلاڑی کی جو بھی پوزیشن ہو، میچ کی صورت حال سے زیادہ ہر اُس گیند پر نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جو پھینکی یا کھیلی جا رہی ہو۔ امپائر کی ذمہ داری ہر گیند کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔

علیم ڈار نے ایک موقع پر ٹیکنالوجی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا اگر کیمروں کا خوف ذہن پر سوار ہو یا تھرڈ امپائر کوئی فیصلہ تبدیل بھی کر دے تو اسے اعصاب پر سوار کرنا درست نہیں۔ غلطی کو اگر ذہن میں بٹھا لیں تو پھر ایسے فیصلوں کے امکانات مزید بڑھ جاتے ہیں۔

حال ہی میں علیم ڈار نے ایک اور سنگِ میل عبور کر لیا۔ وہ 150 میچز میں ذمہ داریاں نبھانے والے دُنیا کے ساتویں امپائر بن گئے ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے سب سے زیادہ میچز میں امپائرنگ کرنے والے ایشیائی امپائر کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اب وہ 150 سے زیادہ ون ڈے میچز میں ذمہ داری انجام دینے والے امپائر کے خصوصی کلب میں شامل ہو گئے ہیں۔ تاریخ کے ساتویں امپائر کا اعزاز انہوں نے حال ہی میں انگلینڈ اور آسٹریلیا کے درمیان لارڈز میں کھیلے گئے ون ڈے میں امپائرنگ کر کے حاصل کیا۔

علیم ڈار...... پاکستانیوں کے لیے ایک قابلِ فخر سپوت ہے۔ صرف ایک شخص نے تن تنہا احساس ذمہ داری اور ایمان داری سے دُنیا بھر کے لوگوں کا اعتماد جیتا اور ثابت کیا کہ خلوصِ نیت سے کی گئی کوششیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ علیم ڈار کرکٹ کے بحرانوں کے شکار ملک کے لیے ایک روشن ستارے کی مانند ہیں۔

☆......☆......☆

مختصر مختصر

شکر

ایک شخص اللہ تعالیٰ سے دُعا کررہا تھا کہ اے اللہ! مجھے صبر عطا کر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا سنی تو فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ سے صبر نہ مانگ کیوں کہ صبر مصیبت پر کیا جاتا ہے۔ پہلے مصیبت آئے گی پھر صبر کی توفیق ملے گی۔ تُو اللہ سے شکر ادا کرنے کی توفیق مانگ کیوں کہ تُو شکر ادا کرنے کی توفیق مانگے گا تو پہلے نعمت ملے گی پھر شکر کی توفیق عطا ہوگی۔''

(محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

چغل خور

سلیمان بن عبدالمالک نے ایک مرتبہ ایک آدمی سے کہا۔

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ تُو نے میری برائی بیان کی ہے اور فلاں فلاں بات کہی ہے۔''

وہ آدمی گویا ہوا۔ ''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔''

سلیمان بن عبدالمالک نے کہا۔

''مجھے اس بات کی خبر ایک سچے آدمی نے دی ہے۔''

اُس شخص نے کہا۔ ''چغل خور سچا نہیں ہوسکتا۔''

سلیمان بن عبدالمالک نے کہا۔ ''تُو نے سچ کہا ہے۔''

(بریعہ سلیم، لاہور)

غصہ

غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہوکر ندامت پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے مذہب نے بھی غصہ کو حرام قرار دیا ہے کیوں کہ غصہ میں انسان وہ کر جاتا ہے، جس کا بعد میں اُسے سنگین خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ غصہ کی حالت میں ٹھنڈا پانی پی لیا جائے۔ کھڑے ہیں تو بیٹھ جائیں یا پھر وضو کرلیں یا پھر اُس جگہ سے چلے جائیں۔ غصہ نے ہی انسان کو انسان کا دشمن بنا دیا ہے۔ ہمیں کسی کی بات سننا گوارا نہیں۔ غصہ انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ غصہ تھوکیے اور ہنستے ہنساتے زندگی گزاریئے۔

(علی حسنین، بھوآنہ)

چاندی کی چابی

ایک دفعہ سردیوں کے موسم میں ایک مسافر چلتے چلتے رات کے وقت ایک سرائے میں پہنچا۔ مسافر نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک چوکی دار نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور پھر مسافر کو دیکھ کر دروازہ بند کرلیا۔

مسافر نے دوبارہ دستک دی تو چوکی دار بولا: ''دروازہ چاندی کی چابی سے کھلے گا جو اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔'' مسافر سمجھ گیا کہ چوکی دار لالچی ہے، اُسے رشوت چاہیے۔ مسافر نے جیب سے کچھ روپے نکالے اور چوکی دار کو دے دیے۔ اب مسافر اندر آ چکا تھا۔ مسافر نے چوکی دار سے کہا: ''مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔ میں تمہارا بڑا احسان مند رہوں گا اگر تم مجھے چائے لاکر دو۔'' چوکی دار چائے لینے چلا گیا اور جب واپس آیا تو دروازہ بند تھا۔ چوکی دار نے دروازے پر دستک دی تو مسافر نے کہا: ''دروازہ چاندی کی چابی سے کھلے گا جو میرے پاس نہیں ہے۔''

یہ الفاظ سن کر چوکی دار بہت شرمندہ ہوا اور مسافر سے اپنے کیے کی معافی مانگی۔

(اقراء رانی، سرگودھا)

ایک خط

دُنیا کی سب سے بڑی غیر سیاسی تنظیم برائے ماؤں کے حقوق کے سربراہ جان مچل نے کہا۔

''مجھے اپنی ماں سے بہت نفرت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی ایک آنکھ تھی۔ شادی کے بعد میں اُسے برسوں نہیں ملا تھا۔ میری ماں نے مرنے سے کچھ دن پہلے میرے نام ایک خط چھوڑا جس میں اس نے لکھا تھا۔

"اے میرے پیارے بیٹے!

تم نے ساری زندگی مجھ سے نفرت کرنے میں گزار دی، صرف اس وجہ سے کہ میں ایک آنکھ سے اندھی ہوں۔ میں اب اس دُنیا میں چند دنوں کی مہمان ہوں۔ دُنیا سے جانے سے پہلے میں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ ایک روز جب تم بہت ننھے منے تھے تو ہم دونوں ایک کام کی غرض سے کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں اچانک ہم ایک حادثے کا شکار ہو گئے، ہمیں فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا۔ جب تمہیں ہوش آیا تو تم اپنی آنکھ سے محروم ہو چکے تھے۔ تم دُنیا کے لیے بدصورت بن چکے تھے۔ میں نے تم سے نفرت نہ کی بلکہ پہلے سے زیادہ محبت کرنا شروع کر دی۔ پھر ایک روز میں نے فیصلہ کیا اور اپنی ایک آنکھ وقف کر دی اور میری آنکھ تمہیں لگا دی گئی کیوں کہ میں تم سے بے پناہ پیار کرتی تھی، میں ماں تھی اور ماں اپنے بچے کو ہمیشہ خوب صورت دیکھنا چاہتی ہے۔ میں یہ اقرار کرتی ہوں کہ میں اب بھی تم سے بے پناہ پیار کرتی ہوں۔"

(محمد زبیر ارشد، ملتان)

حلوائی

نورا حلوائی شہر کا سب سے مشہور حلوائی تھا۔ پورے شہر میں اس کی مٹھائی پسند کی جاتی تھی۔ ایک دن اُس کی دُکان پر ایک دیہاتی مٹھائی لینے آیا۔ اُس نے حلوائی سے پانچ کلو مٹھائی تولنے کا کہا۔ حلوائی نے دیہاتی کی سادہ لوحی دیکھتے ہوئے اُسے پانچ کلو سے کم مٹھائی تول کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ وزن میں کم ہے۔"

دیہاتی نے پوچھا: "وہ کیوں؟"

اس پر حلوائی نے جواب دیا: "یہ میں نے تمہاری سہولت کے لیے کیا ہے تاکہ تمہیں زیادہ وزن نہ اٹھانا پڑے۔" دیہاتی حلوائی کی توقع سے زیادہ چالاک نکلا۔ حلوائی نے جب پیسے طلب کیے تو دیہاتی نے اُسے پیسے دیتے ہوئے کہا کہ یہ تھوڑے کم ہیں۔ حلوائی نے پوچھا: "وہ کیوں؟"

اس پر دیہاتی نے جواب دیا: "یہ میں نے تمہاری سہولت کی خاطر کیا ہے تاکہ تمہیں زیادہ گننا نہ پڑیں۔" یہ سن کر حلوائی ٹپٹا کر رہ گیا۔ اُس نے دیہاتی سے معافی مانگی اور مٹھائی پوری تول کر دی۔ دیہاتی نے بھی پورے پیسے ادا کر دیئے اور حلوائی نے توبہ کی کہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

(سلمان ریاض، گوجرانوالہ)

علم اور عمل

استاد نے اپنے شاگرد کو سبق پڑھاتے ہوئے کہا۔

"سچ بولو اور غصہ نہ کرو۔" اگلے دن استاد اپنے شاگرد کو سبق سنانے کے لیے کہتے ہیں تو شاگرد جواب دیتا ہے کہ مجھے سبق یاد نہیں ہے۔ استاد اُسے کچھ نہیں کہتا اور سبق یاد کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ دُوسرے دن بھی استاد کے پوچھنے پر وہ کہتا ہے کہ مجھے سبق یاد نہیں۔ استاد ایک بار پھر نرمی کا مظاہرہ کرتا ہے اور شاگرد کو کچھ نہیں کہتا۔ تیسرے دن استاد شاگرد سے کہتا ہے۔ بھئی سبق سناؤ تو شاگرد کہتا ہے: "مجھے سبق یاد نہیں ہے۔" اب استاد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ زور سے اُس کو تھپڑ لگاتا ہے۔ تھپڑ لگتے ہی شاگرد کہتا ہے: "استاد صاحب! سبق سن لیں۔" استاد حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ تھپڑ لگتے ہی تمہیں سبق کیسے یاد ہو گیا؟ شاگرد نے جواب دیا کہ سچ بولنا تو میں نے پچھلے دو دنوں میں سیکھ لیا تھا، لیکن غصہ کرنا میری عادت ہو گئی تھی۔ اس عادت کو ختم کرنے کی میں نے بہت کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس لیے میں نے سچ بول دیا کہ مجھے سبق یاد نہیں ہے۔ آج جب کہ آپ نے مجھے تھپڑ مارا تو میں نے صبر کے ساتھ برداشت کیا اور غصہ نہ کیا۔ حقیقت میں مجھے سبق اب یاد ہوا ہے۔ اس لیے میں نے آپ سے کہہ دیا کہ سبق سن لیں۔ استاد اپنے طالب علم کے اس جذبۂ عمل سے بہت متاثر ہوا اور اُسے شاباش دی۔

(وجیہہ رؤف، لاہور)

ناخن

جب ناخن بڑے ہو جاتے ہیں تو ناخن ہی کاٹے جاتے ہیں انگلیاں نہیں۔ بالکل اسی طرح جب رشتے داروں میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں تو غلط فہمیاں ختم کرنی چاہئیں، رشتے نہیں۔

(سارہ طارق، فیصل آباد)

کہانی ایک روپے کی

(عمیر احمد، سرگودھا)

سب اس کی بات سن کر حیران ہوئے تھے۔ بات حیران کرنے والی ہی تھی۔ بھلا کبھی ایسا ہوسکتا ہے۔ سب اس کو حیرت سے تک رہے تھے۔

''سلیم صاحب! میں ماننے کے لیے تیار نہیں۔'' جعفر نے کہا۔

''آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے، میں نے جو کچھ بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ ایسا محنت سے ممکن ہے۔'' سلیم کی بات سن کر طفیل بولا۔

''بھئی حیرت ہے۔''

''بھئی کس بات پر حیرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔'' یہ آواز منیر کی تھی۔

''حیرت کی بات یہ ہے کہ سلیم صاحب کا کہنا ہے کہ انہوں نے اتنی بڑی دُکان صرف ایک روپے سے شروع کی تھی۔'' جعفر بولا۔

''کیا اتنی شان دار دُکان اور صرف ایک روپے سے شروع کی تھی۔ یہ ناممکن بات ہے۔'' منیر نے کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں، میں آپ لوگوں کو تفصیل بتاؤں گا تو آپ کو یقین آ جائے گا۔'' سلیم کی بات سن کر جعفر نے کہا۔

''تو پھر تفصیل بتایئے۔'' منیر بولا۔

''اس کے لیے آپ سب کو آج رات میرے گھر چلنا ہوگا۔ میں آپ کو اپنی والدہ سے ملواؤں گا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے سچ ہونے کی گواہی آپ کو اُن سے مل جائے گی۔'' سلیم بولا۔

''ٹھیک ہے ہم آج رات دُکان بند کرنے کے بعد تمہارے گھر چلیں گے۔'' ارشد نے کہا۔

رات کے وقت دُکانیں بند کرنے کے بعد سبھی دوست سلیم کے ساتھ اس کے گھر جانے کے لیے تیار تھے۔ سب مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے سلیم کے گھر پہنچے۔ سلیم نے سب کا اپنی والدہ سے تعارف کرایا۔ سلیم نے ٹھنڈے شربت سے اُن کی تواضع کی۔

''اماں جی! میرے دوست یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ کپڑے کی نئی دُکان میں نے ایک روپے سے شروع کی تھی۔'' سلیم نے کہا۔

''میرے بیٹو! سلیم سچ کہتا ہے۔''

''مگر اماں کس طرح؟'' منیر فوراً بولا۔

''یہ سلیم کی زبانی سنو!'' اماں جی کی بات سن کر سلیم بولا۔

''میرے دوستو! بچپن میں میرے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ میری والدہ نے میری پرورش کے لیے بہت محنت کی ہے۔ ایک دن میں سکول سے گھر لوٹا تو کھانے کے لیے گھر میں کچھ نہ تھا۔ مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی۔ میری اماں نے جب میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھوک

مٹانے کے لیے ایک کام میرے ذہن میں آیا۔ میں فوراً گلی میں پرچون کی دُکان پر چلا گیا۔ چچا رحمت وہاں موجود تھے۔ میں نے ان سے ایک روپیہ ادھار لیا اور کاروبار شروع کر دیا۔ میں نے ایک روپے سے جو کاروبار شروع کیا وہ یہ تھا کہ ایک بالٹی میں پانی بھر کر اس میں ایک روپے کی برف ڈالی اور بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ میں نے مسافروں کو ٹھنڈا پانی پلایا۔ شام تک یہ کام میں نے کیا۔ میں گھر لوٹا تو میری جیب میں دس روپے تھے۔ ایک روپیہ چچا رحمت کو واپس کیا۔ نو روپے اب میرے تھے۔ اب سکول سے لوٹنے کے بعد یہ میرا معمول بن گیا۔ میں چند گھنٹوں میں دس پندرہ روپے کما لیتا تھا۔ پھر میں نے اپنی کمائی سے پیسے جمع کر کے ریڑھی بنا لی۔ میرا کاروبار بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اپنی تعلیم بھی ساتھ ساتھ جاری رکھی۔ ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے سائیکل پر پھیری لگا کر کپڑا بیچنا شروع کر دیا۔ چند سالوں ہی میں میری محنت رنگ لائی۔ پھر میں نے دُکان بنانے کا فیصلہ کیا۔ یوں میں نے ایک روپے سے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔"

"واقعی آپ سچ کہتے تھے کہ آپ نے نئی دُکان ایک روپے میں شروع کی ہے۔" جعفر نے کہا۔

"میرے بیٹو! اگر انسان کی نیت صاف ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کے کاروبار میں برکت ڈالے۔" ماں جی کی دُعا پر سب نے آمین کہا۔

(پہلا انعام: 200 روپے کی کتب)

عقل کی بات

(محمد جعفر صادق، بورے والا)

"بھائی صاحب بات سنئے۔" اقبال نے اپنی دُکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو مخاطب کیا۔

"جی کیا بات ہے؟" اجنبی بولا۔

"آپ یہ چائے کی پتی کس ریٹ پر لائے ہیں؟"

"آپ جس ریٹ پر چائے کی پتی بیچ رہے ہیں میں اس سے کم قیمت پر لایا ہوں۔"

"پھر بھی پتہ تو چلے کہ کس قیمت پر پتی لائے ہیں؟" اقبال نے اجنبی کی بات درمیان سے اچک لی۔

"میں سو روپے پاؤ چائے کی پتی لایا ہوں جب کہ آپ ایک سو دس روپے پاؤ دے رہے ہیں، آپ دیکھ لیں پتی ایک جیسی ہے۔" یہ کہہ کر اجنبی تو آگے بڑھ گیا، مگر اقبال بڑبڑایا۔

"آخر یہ چکر کیا ہے اور میں آج دُوسرے دُکان داروں سے بات کروں گا۔"

شام کے وقت سارے دُکان دار اس کی دُکان میں جمع تھے۔

"بھائیو! آج میں نے آپ کو ایک اہم مسئلے کی وجہ سے بلایا ہے۔"

"وہ مسئلہ کیا ہے؟" توفیق نے پوچھا۔

"مسئلہ نیا آنے والا دُکان دار ہے، اس نے سو روپے پاؤ پر

چائے کی پتی کی فروخت شروع کر دی ہے۔" اقبال بولا۔

"اچھا تو یہ بات ہے، میں بھی سوچ رہا تھا کہ اس کی دُکان پر اس قدر رش کیوں رہتا ہے، ہم سب کو اس کے خلاف ایکشن لینا پڑے گا۔" یہ سوچنے کی بات ہے کہ وہ سو روپے پاؤ پتی کس طرح فروخت کر رہا ہے جب کہ تھوک کا ریٹ بھی یہی ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ کم تولتا ہوگا اگر وہ پورا وزن دے گا تو اُسے نقصان ہوگا۔" سرور نے توفیق کی بات سن کر کہا۔

''ہاں ایسا ہی لگتا ہے، ہمیں نئے دُکان دار سے بات کرنی چاہیے۔''

''اقبال تم ٹھیک کہتے ہو۔'' توفیق بولا۔

دُکانیں بند کرنے سے قبل سب دُکان دار نئے دُکان دار سے ملنے کے لیے گئے۔

''آیئے...... آیئے تشریف لایئے۔'' نیا دُکان دار احسان خوش دلی سے بولا۔

''ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم نے مارکیٹ میں آتے ہی پتی کی قیمت خراب کر دی ہے ہم ایک سو دس روپے پاؤ پتی بیچ رہے تھے لیکن تم نے یہاں آ کر سو روپے پاؤ بیچنا شروع کر دی ہے تمہیں پتہ بھی ہے کہ پتی کا تھوک ریٹ سو روپے پاؤ ہے مگر تم اس کے باوجود ایسی حرکت کر رہے ہو...... ہم پوچھنے آئے ہیں کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' اقبال بولتا چلا گیا۔

''اچھا تو یہ بات ہے...... میرے بھائیو میں سو روپے پاؤ پتی بیچ کر بھی فائدہ میں ہوں۔''

''وہ کس طرح؟'' سرور نے حیرت کا اظہار کیا۔

''یہ بات درست ہے کہ میں پتی سو روپے پاؤ خریدتا ہوں اور اسی ریٹ پر بیچ دیتا ہوں بہ ظاہر یہ لگتا ہے کہ میں نے اس میں سے کچھ کمایا نہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں میں نے آج بھی سو روپے پاؤ پتی بیچ کر ایک سو پچاس روپے کمائے ہیں۔''

''بھئی وہ کس طرح؟'' اقبال جھنجھلا سا گیا۔

وہ اس طرح کہ میں نے آج پتی کی دس پیٹیاں فروخت کی ہیں ہر خالی پیٹی کی قیمت پندرہ روپے ہے، میں نے چائے کی پتی تو تھوک ریٹ پر بیچ دی مگر خالی پیٹیوں سے ڈیڑھ سو روپے کما لیے ہیں۔ گاہک پتی کے ساتھ صابن، دالیں اور دُوسرا سامان بھی خرید کر لے گئے ہیں، ان چیزوں کی کمائی الگ ہے۔'' احسان کی بات سن کر سب دُکان دار خاموش تھے۔ انہوں نے کبھی اس کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ احسان نے اپنی عقل مندی کی وجہ سے چند ہی ماہ میں اپنے کاروبار کو ترقی دی اور اس کا شمار اب بازار کے چند بڑے دُکان داروں میں ہونے لگا تھا۔

(دُوسرا انعام انعام: 175 روپے کی کتب)

آپ بیتی

(عائشہ سہروردی، لاہور)

ایک وقت تھا کہ صبح بڑی بے چینی سے میرا انتظار ہوتا تھا۔ لوگ مجھے دیکھ کر اپنے دن کی ابتدا کرتے تھے۔ میرے بغیر ناشتہ ادھورا رہتا تھا۔ مرد ہوں یا عورتیں، بچے ہوں یا بوڑھے، سب میری طرف لپکتے تھے۔ اگر کسی دن میں چھٹی پر ہوتا تو میری کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی۔ لیکن اب وقت کافی بدل گیا ہے۔ میری قدر پہلے جیسی نہیں رہی۔ زمانہ بہت تیز رفتار ہو گیا ہے اور ہر شخص وقت کی کمی کا رونا روتا رہتا ہے۔ آج کل بیشتر نوجوان تو میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ کاروباری حضرات اور خواتین بس ایک سرسری سی نظر ڈال کر اپنے معمولات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ البتہ بزرگ اور ریٹائرڈ افراد اپنی تنہائیوں میں مجھے ضرور شریک کر لیتے ہیں۔ شاید ایسا کرنا ان کی مجبوری ہو۔

جی ہاں، میں ایک اخبار ہوں جسے ہر روز ایک نئی آن بان کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میرے قبیلے کے افراد ہاتھوں کی انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ وہ تعداد میں اگرچہ تھوڑے تھے لیکن ان کا کردار بلند پایہ تھا۔ تب معیار کو مقدار پر ترجیح دی جاتی تھی۔ مقابلے کی ایک صحت مند فضا تھی۔ اب معاملہ کچھ الٹ سا گیا ہو۔

میری مارکیٹ ویلیو کم کرنے میں الیکٹرانک میڈیا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میں اس سے سخت نالاں ہوں۔ جس وقت پرائیویٹ ٹی وی چینلز کی بھرمار نہیں ہوئی تھی، لوگ مجھ پر ہی اعتماد کرتے تھے۔ جب بھی کوئی اہم واقعہ رونما ہوتا تو میرا ضمیمہ بھی شائع کیا جاتا، جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا۔ اب یہی کام چینل والے ''بریکنگ نیوز'' چلا کر پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ میں تو چوبیس گھنٹوں میں ایک بار منظر عام پر آتا ہوں جب کہ ٹی وی کی

نشریات چوبیس گھنٹے مسلسل ''آن ایئر'' رہتی ہیں۔ پرنٹ میڈیا سال میں چند چھٹیاں بھی کرتا ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا میں اس قسم کو کوئی روایت موجود نہیں۔

پہلے مجھے بڑی محبت، محنت اور جذبے کے ساتھ تیار کیا جاتا تھا۔ کاتب حضرات بڑے ذوق کے ساتھ سرخیاں اور شہ سرخیاں لکھتے تھے۔ ہر خبر کی صداقت کو ممکن حد تک پرکھا جاتا، پھر کہیں جا کر اس کی جگہ بنتی تھی۔ زبان و بیان کے اصولوں پر سمجھوتے کا کوئی

تصور بھی نہ تھا۔ صحافتی اقدار کی ترجمانی کے ساتھ علم و ادب کی باریکیوں کا خیال بھی رکھا جاتا تھا۔ اب تو سب کچھ بدل کر رہ گیا ہے۔ رپورٹنگ کا کام انٹرنیٹ نے کافی آسان کر دیا ہے۔ کون سی خبر کس صفحے پر اور کتنی جگہ پر آئے گی، اس مسئلے کو کمپیوٹر کی مدد سے حل کر لیا جاتا ہے۔ اب میرا ظہور صرف کاغذ پر ہی نہیں ہوتا بلکہ تقریباً سبھی اہم اخبارات کے آن لائن ایڈیشن بھی دستیاب ہیں۔

طباعت کے لیے پریس جانے سے چند گھنٹے پہلے تک میرے اِردگرد بڑی گہما گہمی رہتی ہے۔ ہر شعبہ اس کوشش میں ہوتا ہے کہ میری رخصتی وقت پر ہو جائے۔ کس کو سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ پولیٹیکل رپورٹر، کرائم رپورٹر، اکنامک رپورٹر، کلچرل رپورٹر، سپورٹس رپورٹر، سیاسی تجزیہ نگار غرض ہر کسی کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی کاوش کو نمایاں جگہ ملے۔ بہرحال، آخری حکم تو ایڈیٹر صاحب ہی کا چلتا ہے۔ میرے وجود کے ایک بڑے حصے پر اشتہارات بھی قابض ہوتے ہیں۔ جیسے انسانوں کو امیر، غریب اور درمیانے طبقے میں تقسیم کیا جاتا ہے اسی طرح اشتہاروں میں بھی تین درجے ہوتے ہیں۔ امیر قسم کے اشتہارات پورا، نصف یا ایک چوتھائی صفحہ خرید لیتے ہیں۔ درمیانے درجے کے اشتہار ایک، دو یا سہ کالمی ہوتے ہیں۔ غریب اشتہارات چند سطروں پر مشتمل ہوتے ہیں، جنہیں کلاسیفائیڈ بھی کہا جاتا ہے۔

پرنٹنگ کے دوران بھی میرے چاروں طرف ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ مشینیں عجیب و غریب آوازیں نکال رہی ہوتی ہیں اور کارندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہوتے ہیں۔ ہر کوئی دُوسرے پر چیخ رہا ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر اگر بجلی چلی جائے تو کام لٹک جاتا ہے۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ عبور ہوتا ہے اور میں بنڈلوں کی صورت اخبار مارکیٹ پہنچتا ہوں۔ یہاں مختلف نیوز ایجنٹ مجھے ''ہاکروں'' کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان اخبار تقسیم کرنے والوں سے بس مجھے یہی شکایت ہے کہ وہ جلدی میں بڑی بے دردی کے ساتھ مجھے گھروں کے اندر پھینکتے ہیں۔ انہیں اس بات کی قطعی پروا نہیں ہوتی کہ میں کہاں جا کر گروں گا۔ کبھی کبھی تو وہ مجھے گیلی جگہ پر بھی پھینک کر چلے جاتے ہیں۔

گھروں اور دفتروں میں میری عزت افزائی کا دورانیہ بس چند گھنٹے ہی ہوتا ہے۔ شروع میں تو میری بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے، پھر مجھے کسی کونے میں رکھ کر بھلا دیا جاتا ہوں۔ کبھی کبھار کچن کے ریک، کپڑوں کی الماری یا کتابوں کے شیلف صاف کیے جائیں تو پھر میری یاد آتی ہے اور مجھے وہاں بچھا کر ابدی نیند سلا دیا جاتا ہے۔ کچھ عقل مند اور کفایت شعار قسم کے لوگ مجھے جمع کر کے رکھتے ہیں اور ردی کی صورت بیچ ڈالتے ہیں۔ اتنے کم پیسوں میں اپنا سودا ہوتا دیکھ کر غصہ تو بہت آتا ہے لیکن پھر یہ سوچ کر اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب مجھے ایک نئی زندگی ملے گی۔ ری سائیکل ہونے کے بعد میری قدر و منزلت ایک بار پھر بڑھ جائے گی اور کوئی مجھے ردی کے نام سے نہیں پکارے گا۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

☆......☆......☆

مدیرِ تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

اگست کا شمارہ لاجواب تھا۔ آپ نے شیزان کا اشتہار بند کر کے بہت اچھا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اِس کا اجر دے گا۔

(محمد حذیفہ علی، ملتان)

اگست کے شمارے میں لندن اولمپکس 2012 بہترین مضمون تھا۔ یہ مضمون پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ کہانی راستہ دو عمدہ تھی۔ (سعد خالد ظفیر، قلعہ دیدار سنگھ)

چچا تیز گام نے بچوں کو عیدی دی، فرق، چور کون؟ اور راستہ دو عمدہ کہانیاں تھیں۔ انکل کھوج لگایئے کا سلسلہ بہت اچھا ہے اس کو ختم مت کیجیے گا۔ اِس مرتبہ اوجھل خاکے سلسلے کی کمی محسوس ہوئی۔

(عشرہ امین، لاہور)

ستمبر کے شمارے میں ''اوجھل خاکے'' شاملِ اشاعت ہے۔

اِس مرتبہ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ (محمد جعفر، اُسوہ فاطمہ، گروٹ)

اگست کا سرورق بہت پسند آیا۔ پاکستان زندہ باد، دادا جان کی عیدی، چور کون؟ چچا تیز گام نے بچوں کو عیدی دی اور راستہ دو بہترین کہانیاں تھیں۔ (عائشہ مجید، لاہور)

کہانیوں میں میٹھے میاں کی میٹھی عید، پاکستان زندہ باد، چور کون؟ چچا تیز گام نے بچوں کو عیدی دی، دادا جان کی عیدی اور راستہ دو اچھی تھیں۔ (عائشہ ادریس، عبدالمومن ادریس، علی پور)

میں ایک کہانی بھیج رہا ہوں اِسے ضرور شائع کیجیے گا۔

(دانیال احمد، کراچی)

☆ کہانی معیاری ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

''انوکھی دُنیا'' میرا پسندیدہ ناول ہے۔ (محمد ذیشان راجہ، راول پنڈی)

اگست کے شمارے میں چچا تیز گام نے بچوں کو عیدی دی مزے دار کہانی تھی۔ (عبداللہ بٹ، گوجرانوالہ)

''تعلیم و تربیت'' میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس کا ہر سلسلہ بہترین ہے۔ کہانی راستہ دو اچھی تھی۔ (مریم فاطمہ خان، نوشہرہ)

''معلوماتِ عامہ'' ایک مفید سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کے لیے کچھ معلومات بھیج رہی ہوں اسے ضرور شائع کیجیے گا۔

(فاطمہ شکیل، لاہور)

انکل! کیا ہم سلسلہ ''بلاعنوان'' کے لیے ایک سے زیادہ عنوان بھیج سکتے ہیں؟ (ثاقب ضیاء، کوئٹہ)

☆ جی بھیج سکتے ہیں۔

کھوج لگایئے اور اوجھل خاکے کے سلسلے ختم نہ کیجیے گا۔

(حفصہ خان، لاہور)

☆ یہ سلسلے جاری رہیں گے۔

چچا تیز گام کی کہانیاں پڑھ کر ہمیں بہت مزا آتا ہے۔

(عکاشہ فاطمہ، واعظ احمد، گجرات)

قائداعظم کی عیدی، چور کون؟ اور پاکستان زندہ باد اچھی کہانیاں تھیں۔ ''قومی ترانے کی کہانی'' پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔

(حارث تنویر، لاہور)

اگست کا شمارہ اچھا تھا۔ میں سلسلہ ''آپ بھی لکھیے'' کے لیے کہانی بھیجنا چاہتا ہوں۔ (علی رضا، سرگودھا)

☆ کہانی ضرور بھیجیے۔

اگست کے شمارے میں پاکستان زندہ باد اور راستہ دو اچھی کہانیاں تھیں۔ (نائلہ ناز، سانگھڑ)

میں ''تعلیم و تربیت'' آٹھ سال سے پڑھ رہا ہوں۔ میں اس وقت انجینئرنگ کا طالب علم ہوں میں اب بھی اپنا پسندیدہ رسالہ ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔ اگست کا شمارہ اچھا تھا۔

(عرفان خالد، کلور کوٹ)

اگست کے شمارے میں قائداعظم کی عیدی، پاکستان زندہ باد، راستہ دو اور چچا تیز گام نے بچوں کو عیدی دی اچھی کہانیاں تھیں۔

(عائشہ رضا، کراچی)

''بچوں کا انسائیکلو پیڈیا'' ایک مفید سلسلہ ہے، اس سے ہماری

معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ (عمر فاروق، دینہ)

حسن ذکی کاظمی مرحوم جس طرح کی سائنس فکشن کہانیاں لکھا کرتے تھے اسی طرح کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں تاکہ بچے جدید سائنسی ایجادات سے واقف ہوسکیں۔ (فارحہ ظفر، رحیم یار خان)

☆ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

''انوکھی دُنیا'' نہایت دل چسپ ناول ہے۔ ہمیں اس کی ہر قسط کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ (حافظ عمیر فہیم، حویلی لکھا)

''سنہرے لوگ'' عمدہ سلسلہ ہے اِسے جاری رکھیے گا۔

(ثمین رابعہ، گوجرانوالہ)

چچا تیزگام نے بچوں کو عیدی دی اور راستہ دو اچھی کہانیاں تھیں۔

(نور رمضان، فیصل آباد)

حسبِ معمول اگست کے شمارے کی تمام کہانیاں شان دار اور سبق آموز تھیں۔ (اشمل افضل، مناہل افضل، لاہور)

دادا جان کی عیدی، میٹھے میاں کی میٹھی عید، چور کون؟ اچھی کہانیاں تھیں۔ (محمد شہزاد حیدر شیخ، لاہور)

''تعلیم و تربیت'' ایک معیاری رسالہ ہے۔ اگست کے شمارے میں راستہ دو لاجواب کہانی تھی۔ (محمد اجمل شاہین انصاری، چوہنگ)

اگست کے شمارے کا سرورق دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ راستہ دو، چور کون؟ اور دادا جان کی عیدی اچھی کہانیاں تھیں۔

(اسامہ راشد، ٹیکسلا)

اگست کا شمارہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ راستہ دو، پاکستان زندہ باد اور قائداعظم کی عیدی عمدہ کہانیاں تھیں۔

(فاطمہ نصیر، راول پنڈی)

''معلوماتِ عامہ'' اچھا سلسلہ ہے۔

(محمد حسنین معاویہ، محمد ذیشان معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

اگست کے شمارے کا سرورق اچھا تھا۔ (محمد حسن رضا، جوہر آباد)

''بچوں کا انسائیکلو پیڈیا'' بہترین سلسلہ ہے۔ اس کو مستقل جاری رکھیں۔ میری خواہش ہے کہ جب ''تعلیم و تربیت'' کے 75 سال مکمل ہوں تو اس کا ایک شان دار نمبر شائع کیا جائے۔

(فرحان اشرف، بہاول نگر)

☆ ان شاء اللہ ایسا ہی کیا جائے گا۔

''راستہ دو'' اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد کہانی ہے۔ سرورق عید اور یومِ آزادی کے حوالے سے بہترین ہے۔ نظموں کا معیار عمدہ ہے۔ (زبیر ارشد، ملتان)

چچا تیزگام نے بچوں کو عیدی دی اچھی کہانی تھی۔

(پھول پرویز، فیصل آباد)

چور کون؟ پاکستان زندہ باد اور اے وطن پیارے وطن عمدہ کہانیاں تھیں۔ (ایمن اقبال، حیدرآباد)

سنہرے لوگ اور بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہترین سلسلے ہیں۔

(مریم احسن، لاہور)

اگست کا شمارہ اچھا تھا۔ (عائشہ نیاز، جہلم)

شیزان کے اشتہار کے باعث میں نے ''تعلیم و تربیت'' پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ جب سے آپ نے یہ اشتہار شائع کرنا بند کیا ہے میں نے دوبارہ ''تعلیم و تربیت'' پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

(عبدالمجید، جھنگ صدر)

موجودہ حالات پر مبنی حقیقی کہانیوں کی پیش کش ہی ''تعلیم و تربیت'' کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ (عبدالعزیز، کراچی)

اگست کا رسالہ پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ اداریہ سے لے کر بلاعنوان تک ہر ایک چیز بہترین تھی۔ (محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

''انوکھی دُنیا'' بہت اچھا ناول ہے۔ چچا تیزگام نے بچوں کو عیدی دی پڑھ کر بہت لطف آیا۔ (محمد ثاقب، جہلم)

''تعلیم و تربیت'' کا معیار پہلے بہت اچھا ہوا کرتا تھا، درمیان میں اس کا معیار گرا ضرور، لیکن اب ماشاء اللہ معیار پھر بہتر ہو رہا ہے اُمید ہے کہ آپ ایسے ہی رسالے کے معیار کا گراف بلند کرنے میں کوشاں رہیں گے۔ (ش۔م۔ دانش، میاں والی)

اگست کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ انوکھی دُنیا، چچا تیزگام نے بچوں کو عیدی دی اچھی کہانیاں تھیں۔ (عبدالقدیر، ملتان)

اگست کا شمارہ ٹاپ پر تھا۔ کہانیوں میں چچا تیزگام نے بچوں کو عیدی دی اور چور کون؟ پسند آئیں۔

(بلال حسین، اسلام آباد)

درسِ قرآن و حدیث میں پیغامِ عید بہت اچھا لگا۔ نظم جشنِ آزادی پسند آئی۔ (عفان عثمان، شیخوپورہ)

ڈولی جب برآمدے سے گزر کر عائشہ کے کمرے کے سامنے پہنچی تو کمرے کا دروازہ بند تھا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ ڈولی نے کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اب اُس کے پاس دروازے پر دستک دینے کے سوا کوئی دُوسرا راستہ نہ تھا۔ پھر وہ کافی دیر تک دروازے پر دستک دیتی رہی۔ عائشہ گہری نیند سو رہی تھی، اس لیے اُس نے ابھی تک دروازہ نہیں کھولا تھا۔ ڈولی کافی دیر تک وہاں کھڑی رہی پھر وہ عمر کے امی، ابو کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس سے قبل کہ وہ ان کے دروازے پر دستک دیتی اُس نے دیکھا کہ عائشہ کے کمرے میں روشنی ہوئی ہے۔ وہ فوراً اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اُس نے جب دروازے پر دستک دی تو عائشہ نے پوچھا۔

''کون ہے؟''

''عائشہ! میں ڈولی ہوں۔''

''ڈولی!'' عائشہ نے دہرایا۔

''عائشہ دروازہ کھولو، میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔'' ڈولی نے دستک دینے سے پہلے وہ منتر نہیں پڑھا جس کے باعث انسان ان کی باتیں نہیں سن سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈولی عائشہ کے کمرے میں موجود تھی۔

''اتنی رات گئے تم کون سی ضروری بات کرنے آئی ہو؟'' عائشہ نے ڈولی کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میرے پاس رانی اور روشنی آئی ہیں۔''

''کون رانی اور روشنی؟'' عائشہ نے ڈولی کی بات درمیان سے اچک لی۔ ایسا اس لیے ہوا تھا کہ وہ ڈولی کے آنے کا مقصد جلد از جلد جاننا چاہتی تھی۔

''رانی اور روشنی میری سہیلیاں ہیں وہ اُس جگہ سے آئی ہیں جہاں عمر اور اس کا دوست جواد قید ہیں۔''

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟'' عائشہ کو ڈولی کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں، آؤ میں تمہیں رانی اور روشنی سے ملواتی ہوں وہ دونوں اس وقت عمر کے کمرے میں ہیں۔'' پھر عائشہ ڈولی کے ساتھ عمر کے کمرے میں آ گئی۔ رانی اور روشنی اب عائشہ کے سامنے تھیں۔

''یہ عائشہ ہے، عمر کی چھوٹی بہن۔'' ڈولی نے دونوں سے عائشہ کا تعارف کروایا۔

''میں اس کو پہچانتی ہوں۔'' روشنی بولی۔

''تم مجھے کیسے پہچانتی ہو؟'' عائشہ نے سوال کیا۔

''مجھے یاد ہے جب عمر نے ڈولی کو ریس کورس پارک میں لگنے والی کتابوں کی نمائش میں خریدا تھا، تم اُس وقت اُس کے ساتھ تھی۔ میں نے تمہیں وہیں دیکھا تھا۔'' روشنی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''واہ تمہاری یادداشت تو بہت اچھی ہے، اچھا یہ بتاؤ عمر اور

جواد اس وقت کہاں ہیں؟"

عائشہ کا سوال سن کر روشنی نے اُس ٹھکانے کی نشاندہی کی جہاں عمر اور جواد قید تھے۔ کچھ دیر بعد عائشہ امی ابو کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ امی جان تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھی تھیں اس لیے جلد ہی دروازہ کھل گیا۔ عائشہ نے جب عمر اور جواد کے بارے میں بتایا تو وہ حیران ہوئیں کہ کیا انسان کتابوں کی باتیں سن سکتا ہے۔

"جی امی جان! ایسا ممکن ہے، میں اور عمر اپنے اِردگرد کی چیزوں کی اکثر باتیں سنتے رہتے ہیں۔" عائشہ نے کہا۔

"یہ تو بہت حیرت کی بات ہے، اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے، کیا رانی اور روشنی ہمیں آسانی سے اُس ٹھکانے تک پہنچا دیں گی جہاں عمر اور جواد قید ہیں۔" امی جان کے لہجے میں بے یقینی کی کیفیت تھی۔

نمازِ فجر کے بعد عمر کے ابو جمیل، جواد کے ابو قمر اور جواد کے ماموں انسپکٹر انور پانچ سپاہیوں کو ساتھ لے کر رانی اور روشنی کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچے۔ عائشہ بھی اُن کے ہمراہ تھی۔ وہاں مین گیٹ پر تالا پڑا تھا۔ سپاہیوں نے عمارت میں کود کر عمر اور جواد کو تلاش کیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

"عمارت میں کوئی بھی نہیں۔" ایک سپاہی نے انور کو بتایا۔

"اچھی طرح ساری عمارت کی تلاشی لو۔" انور بولا۔

"سر! ہم ایسا کر چکے ہیں۔" دُوسرے سپاہی نے کہا۔

"جب ہم یہاں سے گئی تھیں تو عمر اور جواد اِسی کمرے میں تھے۔" رانی نے ڈولی کو مخاطب کیا تھا۔

"لگتا ہے جگو کو کسی نے ہمارے یہاں آنے کے بارے میں بتا دیا ہے۔" ڈولی نے روشنی اور رانی کو مخاطب کیا۔ ڈولی نے بولنے سے قبل وہ منتر پڑھ لیا تھا، جس کے باعث وہاں پر موجود کوئی انسان ان کی باتیں سن سکتا تھا۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ روشنی نے کچھ سوچ کر ڈولی سے کہا۔

"یہ کارستانی مجھے ان پرانے جوتوں کی لگتی ہے۔"

"کون سے جوتے؟" ڈولی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو کوڑے کے ڈھیر پر جو بدصورت سے جوتے پڑے ہیں، ہوسکتا ہے انہوں نے ہماری باتیں سن لی ہوں۔"

"ہم نے ایسا نہیں کیا، ہم پر ایسا الزام مت لگاؤ، کچھ دیر پہلے جگو اور اُس کے ساتھی آئے تھے اور دونوں لڑکوں کو یہاں سے لے گئے تھے۔" ایک جوتے نے روشنی کو مخاطب کیا۔

سب لوگ وہاں سے مایوس لوٹے تھے۔ ڈولی تو روشنی اور رانی کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی تھی، مگر روشنی کا کہنا تھا کہ ہوسکتا ہے عمر اور جواد کو اغوا کرنے والے دوبارہ انہیں یہاں لے آئیں۔ اس صورت میں وہ ڈولی کو اطلاع کر دیں گی۔ ڈولی کے دل کو یہ بات لگی تھی۔ وہ دونوں کو وہیں چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

دُوسرے دن جمیل نے راجو کے خلاف گواہی دینے کے لیے عدالت میں جانا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اُس کے سامنے تصویروں کا البم کھولا تھا۔ عمر کے بچپن کی بہت سی خوب صورت تصویریں اس البم میں تھیں۔ جمیل ان تصویروں کو دیکھتا جا رہا تھا اور ماضی کے پردے ہٹتے چلے جا رہے تھے۔ ایک تصویر دیکھ کر بے اختیار اُسے اپنے اکلوتے بیٹے پر پیار آیا تھا۔ یہ تصویر اُس وقت کی تھی جب عمر تین سال کا تھا۔ وہ اپنے ایک عزیز سے ملنے کراچی گئے تو ایک شام ساحلِ سمندر گئے تھے۔ عمر نے ساحل کی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر خوب شرارتیں کی تھیں۔ جمیل کے کیمرے نے ان حسین لمحات کو محفوظ کر لیا تھا۔ جمیل کو یہ تصویر دیکھ کر لگ رہا تھا کہ عمر ابھی تک تین سال کا ہے اور ساحلِ سمندر پر ریت میں کھیل رہا ہے۔ البم کا ورق پلٹنے پر عمر کی وہ تصویر تھی، جس میں وہ پہلی کلاس میں اوّل آنے پر پرنسپل صاحب سے انعام وصول کر رہا تھا۔

"میرا پیارا بیٹا، میرا راج دلارا، میرا پیارا بیٹا۔" یہ بڑبڑاتے ہوئے جمیل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہی بھیگی آنکھوں کے ساتھ اُس کی نظر دائیں طرف دیوار پر لگی قائداعظم اور اپنے والد کی فوجی وردی میں ملبوس تصویروں پر پڑی۔ وہ کافی دیر تک ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ اس کے والد نے جنگ ستمبر میں جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ وہ جب بھی اس تصویر کو دیکھتا تھا اس کا سر فخر سے بلند

ہو جاتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اسی اثناء میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا تو جگو کی آواز اس کے کان میں پڑی۔

''اب بھی وقت ہے راجو کے خلاف گواہی مت دو۔''

''میں ایسا ہی کروں گا، میں ایک فوجی کا بیٹا ہوں، میں ڈرنے والا نہیں ہوں، میں اپنی زمین سے وفا کروں گا خواہ اس کے لیے مجھے کتنی بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔'' جمیل کی پُرعزم باتیں سن کر جگو نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ باتیں کہانیوں، فلموں اور ڈراموں میں اچھی لگتی ہیں، حقیقت کی دُنیا میں آؤ، جب تم عدالت میں پہنچو گے تو تمھیں ایک پیغام ملے گا۔''

''کیسا پیغام؟''

''تمہارے بیٹے کی موت کا پیغام، عدالت کے آس پاس ہمارے آدمی موجود ہوں گے، تم جیسے ہی عدالت میں داخل ہو گے ہمیں اطلاع ہو جائے گی بس اس اطلاع کے ملتے ہی تمہارے بیٹے کو اگلے جہاں پہنچانے کا بندوبست کر دیا جائے گا، اس اطلاع کے لیے اب انتظار کرو۔'' یہ کہہ کر جگو نے فون بند کر دیا۔ جمیل کی دوبارہ نظر بیڈ پر پڑے تصویروں کے البم پر پڑی تھی۔ اُسے اپنا بیٹا ہنستا، کھیلتا اور شرارتیں کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جب وہ اس البم کو دیکھتا تو بیٹے کی محبت جوش مارتی اور جب دیوار پر لگی قائداعظم اور اپنے والد کی تصویروں کو دیکھتا تو وطن کی محبت جوش مارتی تھی۔ جب عمر کی امی جان کمرے میں آئیں تو بیڈ پر پڑے البم کو دیکھ کر وہ ساری بات سمجھ گئی تھیں۔
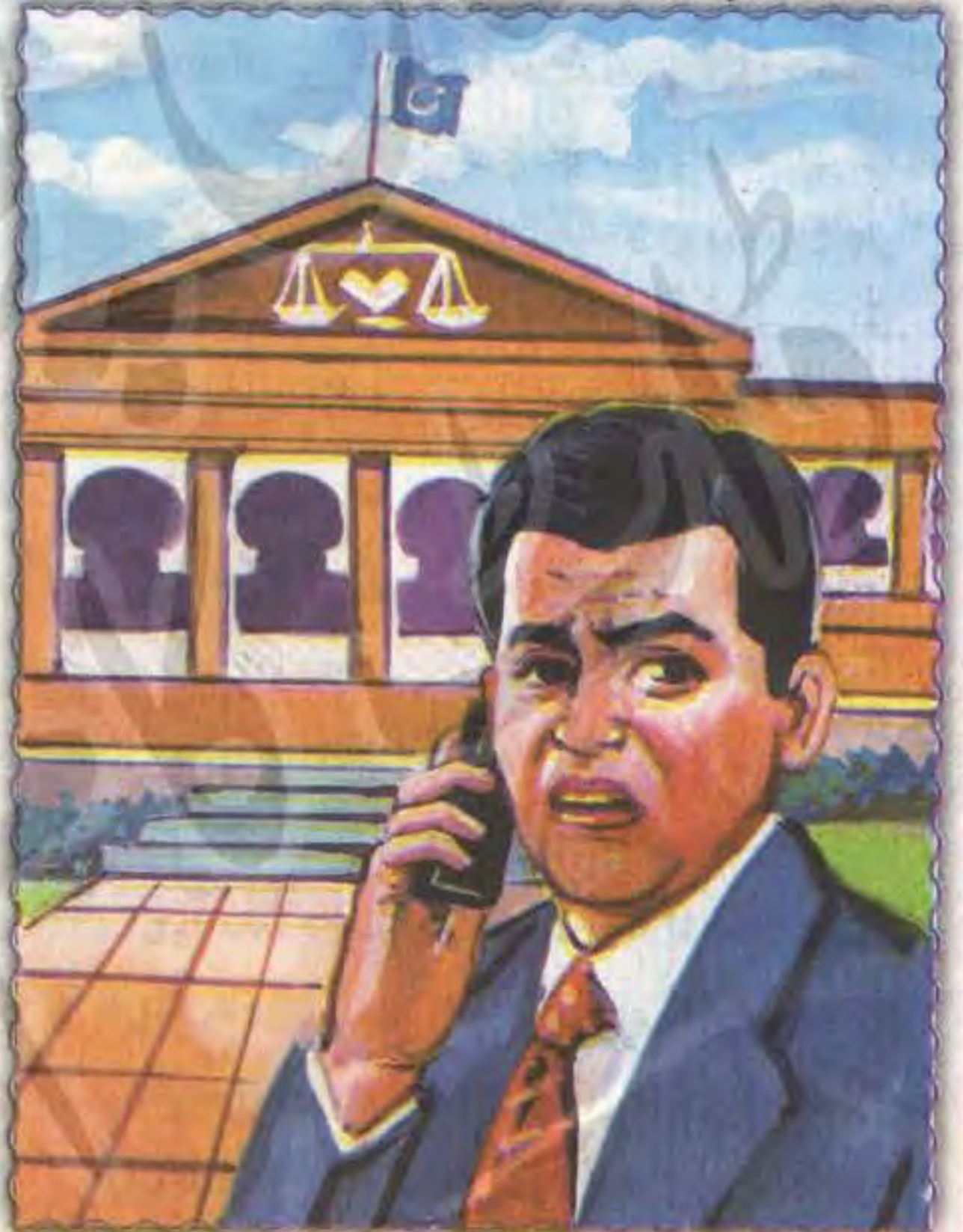
''اب آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''میں پیارے وطن کی لاج رکھوں گا، میں راجو کے خلاف گواہی دوں گا۔''

''یہاں تو بہت سے راجو ہیں، آپ کس کس کے خلاف گواہی دیں گے۔''

''اگر ہر کوئی ایسا سوچنے لگے تو پھر وطنِ عزیز کا رکھوالا کون ہو گا، میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گا، میں راجو کے خلاف گواہی دوں گا، میں اپنے پیارے وطن سے وفا کروں گا، وطن ہے تو ہم ہیں، پیارے وطن ہی سے ہماری پہچان اور شناخت ہے۔'' جمیل کی وطن سے بے لوث محبت کے سامنے عمر کی امی جان لاجواب ہو گئی تھیں۔

دُوسرے دن عدالت میں جانے سے قبل جگو نے جمیل کو پھر فون کیا تھا، مگر وہ اپنے فیصلے کو بدلنے کے لیے تیار نہ تھا۔ دس بجے جب وہ عدالت میں پہنچا تو بہت مطمئن تھا۔ اُس نے راجو کے خلاف گواہی دی کہ اُس نے ہی جنگل سے قیمتی درخت کاٹے تھے۔ وہ گواہی دے کر بہت خوش تھا۔ اُس نے وطن کو نقصان پہنچانے والے ایک مجرم کے خلاف گواہی دی تھی۔ جواد کے والد بھی اب ان کے ہم خیال بن گئے تھے۔ جب وہ گواہی دے کر عدالت کے احاطے سے باہر آیا تو جمیل کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اُس نے سبز بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا تو ایک اجنبی کی آواز سن کر وہ چونکا تھا۔

(جمیل کو کس نے فون کیا تھا؟ یہ جاننے کے لیے اگلی قسط پڑھیے۔)

جواد اور ریاض اپنی سائیکلوں پر سوار گولڈن باغ پہنچے تو سائیکل سٹینڈ کا ملازم شوکت کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دونوں کچھ دیر اُسے دیکھتے رہے۔ شوکت پر نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ ایک بار تو وہ کرسی سے گرتے گرتے بچا تھا۔ دونوں نے سائیکلیں ایک طرف کھڑی کر دیں۔ وہ شوکت کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس سے قبل کہ وہ باغ میں داخل ہوتے شوکت کی اونگھتے ہوئے دونوں پر نظر پڑ گئی۔

''آپ آ گئے ہیں۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''ہاں ہم آ گئے ہیں، لیکن تم ابھی تک نیند کی وادی سے واپس نہیں آئے، کیا رات کو سوئے نہیں تھے؟'' جواد نے شوکت سے ٹوکن لیتے ہوئے پوچھا۔

''رات مالی بختو کی بیٹی کی شادی تھی، وہاں خاصی دیر ہو گئی تھی، بس نیند پوری نہیں ہو سکی، جس کی وجہ سے کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا ہوں۔'' شوکت نے اپنے اونگھنے کا سبب بیان کیا۔

''اب لوگ سیر کرنے کے لیے باغ میں آنا شروع ہو گئے ہیں، دھیان سے بیٹھنا یہ نہ ہو کہ کوئی چور موٹر سائیکل یا سائیکل اٹھا کر لے جائے۔'' ریاض نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں اب کرسی پر نہیں بیٹھوں گا، کھڑا رہوں گا تو پھر نیند نہیں آئے گا۔'' شوکت کی بات سن کر دونوں سیر کے لیے باغ کی طرف بڑھے۔

جواد اور ریاض کی کافی عرصہ بعد اس باغ میں ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں میٹرک تک اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ میٹرک کے بعد دونوں کا ایک دُوسرے سے رابطہ برقرار نہ رہا تھا۔ ایک سال قبل باغ میں سیر کرتے ہوئے جواد نے ریاض کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میرا خیال ہے تم ریاض ہو۔''

''تمہارا خیال درست ہے اور تم جواد ہو۔''

پھر دونوں بغل گیر ہو گئے۔ جواد نے بتایا کہ وہ شاہ عالمی میں کھلونوں کی ایک دُکان پر سیل مین ہے۔ ریاض گھروں میں بجلی کی وائرنگ کا کام کرتا تھا، اُس نے لال پل کے پاس ایک چھوٹی سی دُکان بنا رکھی تھی۔ وہ اُس دن کافی دیر تک زمانہ طالب علمی کی باتیں یاد کرتے رہے۔ وہ اُس واقعے کو یاد کر کے بہت ہنسے تھے جس میں انہوں نے ماسٹر اللہ داد کو چوہے سے ڈرایا تھا۔ دونوں نے ایک مردہ چوہا ماسٹر اللہ داد کی میز کی دراز میں رکھ دیا تھا۔ جب وہ جماعت میں آئے تو دراز کھولتے ہی مردہ چوہا دیکھ کر انہوں نے

چیخ ماری تھی۔ یہ چیخ سن کر پہلے تو طلبہ گھبرائے تھے پھر زور دار قہقہے لگانے لگے۔ ماسٹر اللہ داد نے چلّا کر کہا۔

''خاموش ہو جاؤ۔''

ان کی چیخ کی آواز سن کر ساتھ والی جماعت سے ماسٹر عقیل بھی آ گئے تھے۔ ماسٹر اللہ داد کے بتانے پر وہ بھی مردہ چوہے کا دیدار کر چکے تھے۔ اب دونوں ماسٹر کسی سراغ رساں انسپکٹر کی طرح میز کی دراز میں چوہا رکھنے والے کو تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ آخر وہ جواد اور ریاض کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس جرم کی پاداش میں دونوں سارا دن جماعت میں کھڑے رہے تھے۔ دونوں جب باغ سے نکلنے لگے تو موبائل فون نمبروں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ جواد ابھی تک اپنے آبائی گھر میں رہتا تھا، ریاض نے وہ گھر دیکھ رکھا تھا۔ ریاض نے راحت کالونی میں تین مرلے کا مکان خریدا تھا، اُس نے جواد کو اپنے نئے گھر کا پتہ لکھوا دیا تھا۔ اب تو روزانہ ان کی باغ میں ملاقات ہونے لگی تھی۔ شوکت کو علم ہو گیا تھا کہ دونوں سکول کے دوست ہیں۔ شوکت پچھلے پانچ سال سے اس اسٹینڈ پر ملازم تھا۔ اس کا تعلق سیال کوٹ سے تھا وہ یہاں ملازمت کے سلسلہ میں آیا تھا۔ اسٹینڈ کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کوارٹر ٹھیکے دار نے اُسے بنوا کر دیا تھا۔ اس کی تنخواہ بس مناسب سی تھی۔ شوکت نہایت ایمان داری سے کام کر رہا تھا۔ یوں تو سب کچھ ٹھیک، مگر جب شوکت پر نیند کا غلبہ آتا تو وہ بے بس ہو جاتا تھا۔ وہ کرسی پر ہی خراٹے مارنے لگتا تھا۔ ایک دن وہ کرسی پر بیٹھا نیند کے مزے لوٹ رہا تھا تو کچھ شرارتی لڑکوں نے ایک سائیکل اٹھا کر ایک جھاڑی کی اُوٹ میں چھپا دی تھی۔ اب یہ شرارتی لڑکے جھاڑی کی اُوٹ ہی میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب سائیکل کا مالک آیا تو سائیکل غائب تھی۔ شوکت کے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

''جب تم کرسی پر بیٹھے سوتے رہو گے تو یہی کچھ ہو گا۔'' سائیکل کے مالک نواز نے کہا۔

''میں ابھی سائیکل تلاش کرتا ہوں، آپ بے فکر ہو جائیں، سائیکل آپ کو مل جائے گی۔'' دراصل شوکت نے جھاڑی کی اُوٹ سے جھانکتے ہوئے بلال اور اُس کے دوستوں کو دیکھ لیا تھا۔ سائیکل کا ہینڈل بھی اُسے نظر آ گیا تھا۔ وہ دائیں طرف سے ہو کر جھاڑی کی طرف بڑھا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بلال کو کان سے پکڑ لیا۔ بلال تو پکڑا آ گیا تھا، مگر اس کے دوست ''چچا نیند، چچا نیند'' کا شور مچاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

''چچا! معاف کر دیں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے بلال نے اپنا کان جو شوکت نے پکڑ رکھا تھا چھڑانے کی کوشش کی تھی۔

''تم پہلے بھی ایسی حرکت کر چکے ہو، بچو اب تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کروں گا۔'' شوکت کے ایک ہاتھ میں سائیکل تھی اور دُوسرے ہاتھ میں بلال کا کان تھا۔

''لیجیے، آپ کی سائیکل حاضر ہے۔'' شوکت نے نواز کو سائیکل تھماتے ہوئے مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو یہ سائیکل چور ہے۔'' نواز نے بلال کو گھورا۔

''جی نہیں آپ کا اندازہ درست نہیں، یہ سائیکل چور نہیں، شرارتی ٹولے کا سرغنہ ہے، میں جب تھوڑی دیر کے لیے نیند کی وادی میں چلا جاتا ہوں تو یہ شرارتی، سائیکل کو جھاڑیوں کی اُوٹ میں چھپا کر مجھے تنگ کرتے ہیں۔'' شوکت کی بات سن کر بلال نے کہا۔

''آپ نے جو کہا ہے وہ غلط ہے۔''

''میں نے کیا غلط کہا ہے۔'' شوکت نے آنکھیں نکالیں۔

''آپ تھوڑی دیر کے لیے نہیں کافی دیر کے لیے نیند کی وادی میں چلے جاتے ہیں اور لمبے لمبے خراٹے بھی مارتے ہیں، چچا یہ کرسی کے پاس کیا ہے!''

شوکت کا دھیان کرسی کی طرف گیا تو بلال اپنا کان شوکت کے ہاتھ سے آزاد کروا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس سے قبل کہ شوکت، نواز کی سائیکل ادھار لے کر بلال کا تعاقب کرتا وہ اولمپکس مقابلوں کی سو میٹر ریس کے کھلاڑی کی طرح دوڑتا ہوا سڑک پار کر گیا تھا۔

''یہ بچے شرارتی ضرور ہیں، مگر چور نہیں، میں ان سے دل بہلاتا رہتا ہوں۔'' شوکت کے لہجے میں اپنائیت اور پیار کی جھلک کو نواز نے بھی محسوس کیا تھا۔

ایک دن اور جواد اور ریاض باغ کی سیر کر رہے تھے تو ریاض نے محسوس کیا کہ جواد کچھ چپ چپ سا ہے۔ ریاض نے خاموشی کی وجہ دریافت کی تو جواد آہ بھر کر بولا۔

''میں خود تو پریشان ہوں خواہ مخواہ تمھیں پریشانی نہیں کرنا چاہتا۔''

''تم ایسا کیوں سوچتے ہو، میں تمہارا دوست ہوں، اپنی پریشانی مجھے بتاؤ ہوسکتا ہے میں اس کا کوئی حل تمھیں بتا دوں۔''

''بات یہ ہے کہ میں جس گھر میں رہ رہا ہوں وہ ہمارا آبائی گھر ہے، نیچے والی منزل میں دو کمرے ہیں جب کہ اُوپر ایک کچا سا کمرہ ہے، بھائی کے بچے بڑے ہو گئے ہوں اس لیے گزارہ مشکل سے ہو رہا ہے، بھائی نے دو ماہ قبل مجھے کہا تھا کہ دُوسری منزل پر ایک کمرہ بنالوں۔''

''تو بنا لو دُوسری منزل پر ایک کمرہ۔'' ریاض درمیان میں بولا۔

''کیسے بنالوں کمرہ، تنخواہ میں زندگی کی گاڑی بہت مشکل چل رہی ہے، کہاں جاؤں، کیا کروں۔''

''تمھیں کہیں جانے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' جواد نے پوچھا۔

''ایک ہفتہ بعد 90 ہزار روپے کی کمیٹی مجھے ملنے والی ہے، میں یہ رقم تمھیں دے دوں گا، اس طرح تمہاری پریشانی دُور ہو جائے گی۔''

جواد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک ہفتہ بعد 90 ہزار روپے کی رقم جواد کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ ریاض سے رقم حاصل کر کے خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی اپنے مقصد میں کام یاب ہو جائے گا۔ ریاض آسانی سے اس کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اب جب بھی دونوں کی باغ میں ملاقات ہوتی جواد یہی کہتا ہے کہ کمرہ بس مکمل ہونے والا ہے۔ جواد جب بھی پیسوں کی واپسی کی بات کرتا تو ریاض فوراً کہتا۔

''میں کب تمھیں پیسے واپس کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں، جب مجھے ضرورت ہو گی میں تم سے پیسے مانگ لوں گا، تم کیوں غیروں جیسی باتیں کرتے ہو۔''

جواد کو ریاض سے 90 ہزار روپے لیے دو سال ہو چکے تھے۔ ریاض کو ایک سرکاری عمارت کی وائرنگ کا ٹھیکہ ملا تھا۔ اُسے کام شروع کرنے سے قبل بطور زرِ ضمانت چار لاکھ روپے جمع کروانے تھے۔ اُسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ جب اُس نے جواد سے نوے ہزار روپے کی واپسی کے لیے کہا تو وہ فوراً بولا۔

''میں جلد تمھیں پیسے واپس کر دوں گا۔''

ریاض کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ جواد ہر ملاقات پر مزید وقت طلب کرے گا۔ ایک دن اچانک ریاض جواد کے دروازے پر کھڑا تھا۔ جب اُس نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کسی مرد نے دریافت کیا۔

''کون ہے؟''

'میں ریاض ہوں، جواد کا دوست، میں جواد سے ملنا چاہتا ہوں۔'' ریاض نے بلند آواز میں کہا۔

''جواد تو کئی دنوں سے گھر نہیں آیا۔'' یہ کہتے ہوئے جواد کے بڑے بھائی فواد نے دروازہ کھول دیا۔

''جواد کیوں گھر نہیں آیا؟'' ریاض نے فواد کو دیکھتے ہی سوال کیا۔

''وہ من موجی ہے جب دل چاہتا ہے گھر آ جاتا ہے، جب دل نہیں چاہتا تو ہفتوں گھر کا رخ نہیں کرتا۔'' فواد کے لہجے میں جو دکھ تھا اُسے ریاض نے محسوس کیا تھا۔ اُس نے جب آنے کا مدعا بیان کیا تو فواد سرد آہ بھر کر بولا۔

''کمرے بنانے کے بہانے وہ کئی لوگوں سے پیسے لے چکا ہے مگر کمرہ پھر بھی نہیں بن سکا۔''

ریاض جب وہاں سے چلا تو اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ اب جواد نے باغ میں آنا بھی کم کر دیا تھا۔ وہ اُس وقت باغ میں آتا تھا جب ریاض واپس جا چکا ہوتا تھا۔ اس نے اپنا موبائل فون بھی بند کر رکھا تھا۔ ریاض کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا دوست اس کے ساتھ ایسا کرے گا۔ وہ کوشش کے باوجود جواد کو تلاش نہ کر پایا تھا۔

رات سے بارش ہو رہی تھی۔ صبح کے وقت بارش کی شدت میں کمی تو ہوگئی تھی، مگر ہلکی ہلکی پھوار ابھی باقی تھی۔ اسی پھوار میں بھیگتا ہوا جواد کافی دنوں کے بعد گولڈن باغ میں آیا تھا۔ شوکت ایک ترپال کے نیچے کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

''شوکت! اتنے خوب صورت موسم میں بھی سو رہے ہو۔'' جواد نے سائیکل ایک طرف کھڑی کرتے ہوئے شوکت کو مخاطب کیا۔

''اس موسم میں تو سونے کا مزا آتا ہے، نیند نگر سے نیند آ کر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔'' شوکت جمائی لے کر بولا۔

''لو میری سائیکل کھڑی ہے، میں بھی باغ میں جا کر موسم سے لطف اندوز ہولوں۔'' یہ کہہ کر جواد باغ کی طرف بڑھ گیا۔ اُسے ابھی باغ میں گئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ دائیں طرف سے اُسے ریاض آتا دکھائی دیا۔ ریاض کو دیکھ کر وہ فوراً ایک درخت کی اُوٹ میں ہو گیا تھا۔ پھوار ابھی تک جاری تھی۔ وہ جامن کے باغ سے ہوتا ہوا اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں ریاض تو اُس کا تعاقب نہیں کر رہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اسٹینڈ میں موجود تھا۔ شوکت حسبِ معمول کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ جواد بہت جلدی میں تھا۔ اُس نے سو روپے کا نوٹ شوکت کو دیتے ہوئے کہا۔

''جلدی سے 90 روپے واپس دے دو۔''

''میرے پاس کھلے پیسے نہیں ہیں، میں ابھی کھلے پیسے لا کر آپ کو بقایا پیسے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شوکت کرسی سے اٹھنے لگا تو جواد جو کہ بہت جلدی میں تھا فوراً بولا۔

''اس وقت مجھے جلدی ہے، میں بقایا پیسے پھر لے لوں گا۔''

شوکت اسے روکتا ہی رہا، مگر جواد سائیکل پر سوار وہاں سے چلا گیا۔ شوکت نے سو روپے کا نوٹ جیب میں ڈال لیا۔ شام کو ٹھیکے دار آیا تو دن بھر کے پیسوں کا حساب دینے کے بعد جواد کے بقایا 90 روپے اُس نے ایک کاغذ میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔ یہ 90 روپے اس کے پاس جواد کی امانت تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ دُوسرے دن جواد آئے گا تو وہ یہ امانت اُس کے سپرد کر دے گا، مگر جواد اگلے دن تو کیا ریاض کے خوف سے کئی دنوں تک باغ میں نہ آیا۔ خراب موسم کے باعث ریاض بھی باغ میں نہیں آ رہا تھا۔ شوکت جلد از جلد 90 روپے جواد کو واپس کرنا چاہتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کئی ہفتوں کے بعد ریاض باغ میں آیا تو شوکت اُس کی طرف لپکا تھا۔ اُس نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر جواد کے گھر کا پتہ پوچھا تو ریاض نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمھیں جواد سے کیا کام آن پڑا ہے؟''

''میں 90 روپے جواد کو واپس کرنا چاہتا ہوں، ان روپوں کے باعث میں بہت پریشان ہوں۔'' شوکت کی زبانی ساری بات جان کر ریاض نے اُسے جواد کے گھر کا پتہ تو بتا دیا تھا، مگر اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ جواد نے اُس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ شوکت، جواد کے گھر کا پتہ حاصل کر کے بہت خوش تھا۔ شام کے وقت وہ جواد کا گھر تلاش کرنے میں تو کام یاب ہو گیا، مگر اس کی جواد سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ شوکت جس قدر جلد 90 روپے کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا اُسی قدر اس کام میں دیر ہو رہی تھی۔ وہ ایک ہفتہ کے دوران تین بار جواد کے گھر اُسے ملنے جا چکا تھا، مگر وہ گھر ہوتا تو اُس سے ملتا۔ ان روپوں کے باعث اس کی نیند بھی جاتی رہی تھی۔ وہ رات سونے کے لیے لیٹتا تو روپوں کا خیال آتے ہی اُس کی نیند اُڑ جاتی تھی۔ دن بھر اسٹینڈ پر کرسی پر بیٹھے ہوئے وہی نیند جو ہر وقت اُس کی آنکھوں میں بسیرا کیے رکھتی تھی، یوں غائب تھی جیسے نیند کا اس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

اُس دن دوپہر ہی سے آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام کے وقت شوکت 90 روپے جیب میں رکھے جواد کے گھر پہنچا تو دروازے پر دستک دینے پر جواد نے جب خود ہی دروازہ کھولا تو بے اختیار شوکت کی زبان سے نکلا۔

''شکر الحمدللہ۔''

''کس بات کا شکر ادا کر رہے ہو؟'' جواد نے پوچھا۔

''آپ کے ملنے کا۔'' یہ کہہ کر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر

90 روپے نکال کر جواد کو دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے آج رات سکون کی نیند آئے گی، میں تو کافی دنوں سے سکون کی نیند سو نہیں سکا، ان 90 روپوں کے ہوتے ہوئے مجھے سکون کی نیند کیسے آ سکتی تھی، یہ روپے آپ کے ہیں، ان کو اپنے پاس رکھ کر میں آرام و سکون کی نیند کیسے سو سکتا تھا، شکر الحمد للہ میں اس امانت کو آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہوں، میں آج خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔'' شوکت کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ جواد کے دل پر اثر کرتا جا رہا تھا۔ وہ تو اُسے 90 روپے دے کر سکون حاصل کر کے چلا گیا، مگر جواد کو بے سکون کر گیا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں رات بھر سو نہیں سکا تھا۔ ریاض سے لیے 90 ہزار روپے بار بار اُس کی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ نیند اُس سے کوسوں دُور تھی جب کہ دُوسری طرف شوکت پُرسکون نیند کے مزے لوٹتے ہوئے زور دار خراٹے لے رہا تھا۔ یہ رات تو جیسے تیسے جواد نے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح ہوتے ہی وہ ریاض کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ ندامت سے

اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ رات بھر جاگنے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''لگتا ہے تم رات بھر سوئے نہیں۔'' ریاض کے سوال پر جواد بولا۔

''ایک مدت کے بعد تو نیند سے بیدار ہوا ہوں، میں اب دوبارہ ایسی غفلت کی نیند سونا نہیں چاہتا، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

یہ کہہ کر جواد نے چار ہزار نوے روپے جیب سے نکال کر ریاض کو تھماتے ہوئے کہا۔

''دوست! میں تمہارا ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گا، مجھے تھوڑی سی مہلت دے دو، یہ رقم پہلی قسط سمجھ کر رکھ لو، میں محنت کر کے بہت جلد تمہارے پیسے واپس کر دوں گا۔''

ریاض نے جب پیسے گنے تو وہ چار ہزار نوے روپے تھے۔ اُس نے جب نوے روپوں کے بارے میں پوچھا تو جواد بولا۔

''یہ نوے روپے ہی تو ہیں جن کے باعث میں گہری نیند سے بیدار ہوا ہوں، نہ یہ نوے روپے شوکت کے پاس رہتے اور نہ میں گہری نیند سے بیدار ہوتا۔''

''میں تمہاری بات سمجھ نہیں پایا۔'' ریاض نے اُلجھے لہجے میں کہا۔

اس کے جواب میں جب جواد نے ساری بات بتائی تو ریاض نے کہا۔

''شوکت نے بہت اچھا کام کیا ہے، شوکت جیسے لوگ ہمارا مان ہیں، ہماری پہچان ہیں، ایسے لوگوں کو معمولی سمجھا جاتا ہے، مگر ایسے لوگ ہی غیر معمولی کام کرتے ہیں۔''

جواد جب وہاں سے رخصت ہوا تو اُسے یقین تھا کہ وہ آج رات سکون کی نیند سوئے گا۔ اب دونوں دوست جب بھی گولڈن باغ جاتے ہیں تو شوکت کو کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھتا دیکھ کر اُس پر رشک کرتے ہیں کیوں کہ ایسی میٹھی اور پُرسکون نیند بھلا ہر کسی کے نصیب میں کہاں، ایسی نیند تو نصیبوں والوں کو نصیب ہوتی ہے۔
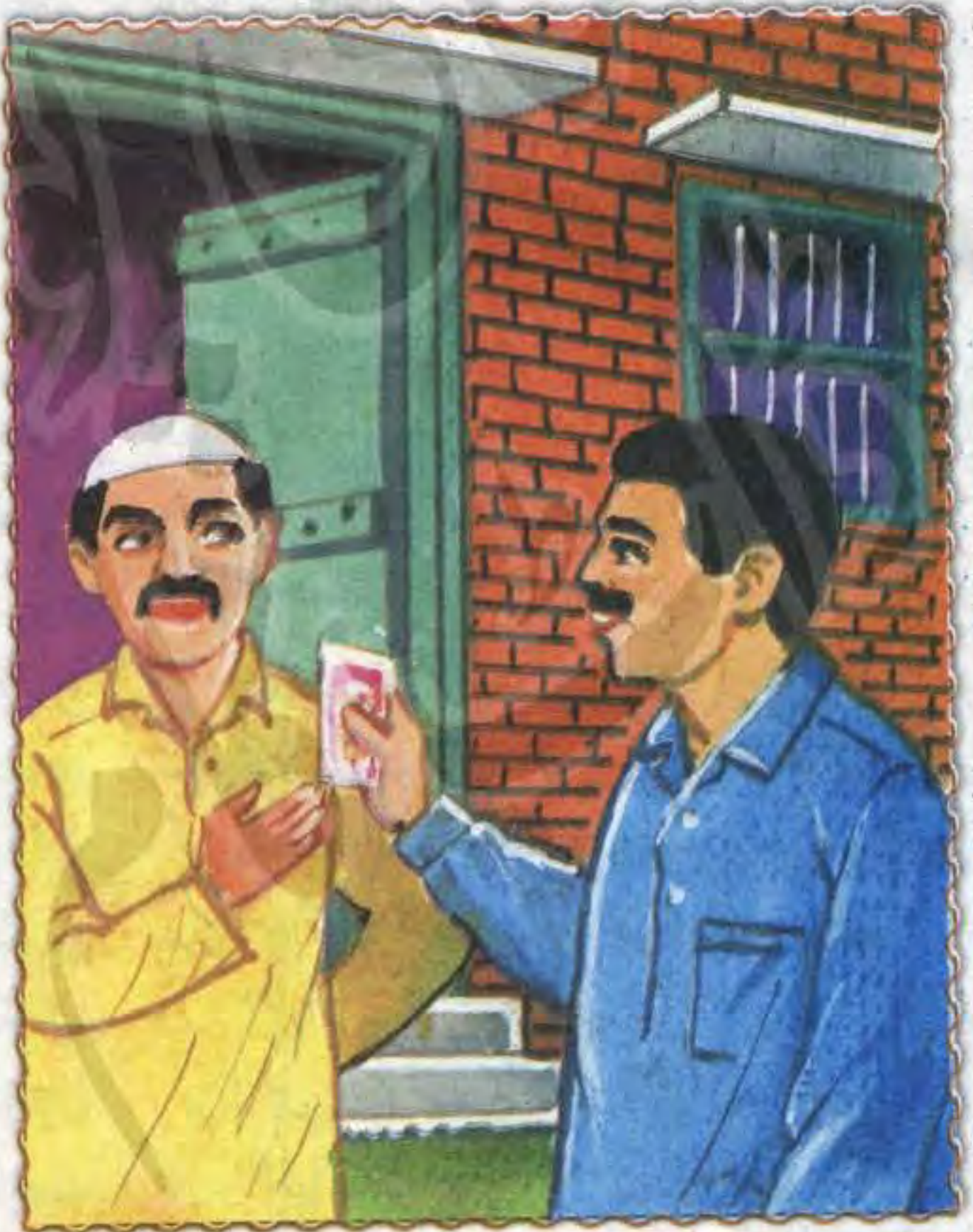
اگست 2012ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی **500** روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- باکمال لوگ، لاجواب سروس۔ (صدیقہ ناز، نوشہرہ)
- دیکھو 14 اگست کے رنگ، چچا رکشہ والے کے سنگ۔ (اسد محمد خان، میاں والی)
- رکشہ ایک، بندے ایک سو ایک۔ (ابوذر احمد، لاہور)
- ایک انار سو بیمار، ایک رکشہ سو سوار۔ (ایمن طاہر، اسلام آباد)
- "چھت پر ابھی جگہ باقی ہے میرے دوست!" (عدینہ جان، ایبٹ آباد)